دکھتے شانے

طبع اول سنہ ۱۹۴۹ء ایک ہزار

قیمت ۲ دو روپیہ

اے، کے، ایم، ایچ جعفر نے قادری پریس نور منزل محمد علی روڈ بمبئی ۳ سے چھپوا کر ساحل پبلشنگ
ہاؤس پوسٹ بکس ۳۳ بھساول (خاندیش) سے شائع کیا

دکھتے شانے

اور

دوسری کہانیاں

از

اشعر ملیح آبادی

ساحل پبلشنگ ہاؤس پوسٹ بکس ۳۳، بھساول (خاندیش)

انتساب

اپنے عزیز دوست جعفر پرویز کے نام

اشعر

۹

فہرست

پیش لفظ

کوشش کرتا تو آسانی سے کسی مشہور افسانہ نگار یا ناقدِ فن کی رائے اس مجموعے میں بطور سفارش اور سند کے شامل ہو سکتی تھی اور جو شخص بھی ان افسانوں کے بارے میں کچھ لکھتا وہ اخلاقاً، مروتاً یا ہمت افزائی کے طور پر کچھ اچھی ہی رائے لکھ دیتا ——— مگر یہ سوچ کر کہ جتنی صاف دلی اور خلوص سے اپنے افسانوں کو ناظرین سے میں خود روشناس کرا سکتا ہوں شاید دوسرا نہ کرا سکے میں خود ہی "پیش لفظ" کے طور پر کچھ لکھ رہا ہوں۔

خود میری نظر میں ان افسانوں کی کیا اہمیت ہے، یہ کہاں تک افسانے کے معیار پر پورے اترتے ہیں، اس بارے میں مَیں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں نے کبھی بھی افسانے کے مروجہ فن اور ٹکنیک کو ذہن میں جما کر افسانہ نہیں لکھا۔ یہ ایک ایسی کمی تھی

جس کو میں آسانی سے پورا کر سکتا تھا۔ مگر میں اپنے خیالات اور اسلوب کو کسی چیز کا پابند نہیں کرنا چاہتا۔ میرے افسانوں کا فن یہی ہے کہ ؏

حقیقتوں کو سنبھالے ہوئے ہیں افسانے

میں افسانہ نگاری میں کسی افسانہ نگار کے اسٹائل یا مواد سے متاثر ہو کر نہیں لکھتا میرے خیالات اور نظریات میرے اپنے تخلیق کردہ ہوتے ہیں۔ میرا ہر افسانہ کسی نہ کسی حقیقت پر منحصر ہوتا ہے۔ میں اس حقیقت کے اظہار پر خود کو مجبور پاتا ہوں۔ اتنا ہی مجبور جتنا شعر کہتے وقت۔ اب اس سے جو واقفیت پیدا ہوتی ہے وہی شاید میرے افسانوں کی روح ہے۔ اور یہ ضروری نہیں کہ میں فن کی پیچیدگیوں اور ٹکنیک کے کرتبوں کی خاطر اس واقفیت کا خون کروں۔

میرے بعض کرم فرماؤں کا خیال ہے کہ میں شاعر ہوں اس لیے مجھے شاعری کے علاوہ کسی اور میدان میں قلم نہ چلانا چاہیے۔ میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ میں پہلے شاعر ہوں بعد میں کچھ اور۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ جب میں زندگی کے تلخ حقایق سے دو چار ہوتا ہوں اور میرے خیالات اور نظریات پر ضرب کاری پڑتی ہے تو میں شاعری کی لطیف اور نازک دنیا سے نکل کر افسانے کی دنیا میں آجاتا ہوں اور یہاں میں اپنے خیالات کا پرچار زیادہ آسانی اور عمدگی سے کر سکتا ہوں۔ میں کبھی پلاٹ سوچ کر افسانہ نہیں لکھتا بلکہ اکثر پلاٹ خود بخود میرے قلم کا پابند ہو جاتا ہے۔

اگر کوئی مجھ سے پوچھے تو میں اپنے ان افسانوں کو ترقی پسند ہی کہوں گا۔ اب ترقی پسند حضرات مانیں یا نہ مانیں۔ میرے نظریات اور عقائد وہی ہیں جو اُن کے، مگر اس زمانے میں پروپیگنڈا اور گروہ بندی کے بغیر کوئی ابھر ہی نہیں سکتا۔ میں موجودہ رسم

اوہام، فرسودہ اور کہنہ سماج اور خواہ مخواہ کے مذہبی ڈھکوسلوں کے خلاف ہوں میں اُن تمام اخلاقی اقدار کو جو محض اعلیٰ طبقوں کی میراث بن کر رہ گئی ہیں فنا کر دینا چاہتا ہوں میں بھی اب۔ نئے نظام کی آس لگائے بیٹھا ہوں اور اپنے وطن کو آزاد دیکھنا چاہتا ہوں سہ

رات خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے
اور خورشید درخشاں کو نکلنا ہوگا

اور میرے اس قسم کے جنسی، سماجی، مذہبی اور سیاسی عقاید کے نقوش ان افسانوں میں مل جائیں گے۔ انھیں میں موجودہ نظام کے خلاف میری آواز کی گونج جگہ جگہ سنائی دے گی۔ البتہ کہیں واضح اور کہیں مبہم۔

اشعر ملیح آبادی

ملیح آباد
۱۱ر اکتوبر ۱۹۴۳ء

باغی

باغی

وہ باغی تھا، مرتد تھا مگر آزاد تھا ـــــ وہ جہاں تھا مطمئن تھا ـــ مہاراج اور پنڈت کی نظر میں وہ کچھ نہ سہی مگر اپنی نظر میں وہ بہت کچھ تھا ـــــ

شانتا نے کن تمناؤں سے اسے پڑھایا تھا ـــــ اس کے باپ عین جوانی میں سورگباش ہو گئے تھے۔ شانتا چاہتی تو دوسرا بیاہ کر سکتی تھی مگر اس نے سوہن کی آتما کو ٹھیس نہ پہنچانا چاہی اور اپنا تن من دھن اپنے پیارے موہن پر نچھاور کر دیا ـــــ پرائمری اسکول کی تعلیم ختم کرانے کے بعد اس کا جی چاہا کہ اپنے موہن کو مڈل پاس کرا دے اور اس نے جی کڑا کر کے محلہ کے ایک بابو جی سے کہہ کر موہن کو گاؤں کے مڈل اسکول میں داخل کرا دیا۔ جو کچھ روپیہ سوہن کے کریا کرم کے بعد بچ رہا تھا وہ موہن کے مڈل اسکول کی تعلیم میں لگ گیا ـــــ موہن مڈل پاس ہو گیا ـــــ اس کے دوسرے ساتھی اسکولوں اور کالجوں میں داخل ہو رہے تھے۔ موہن کے دل میں بھی تعلیم کی امنگ تھی مگر افسوس کہ

اس کی جیب خالی تھی۔ ناچار افسردہ ہو کر بیٹھ گیا ـــــــ مگر وہ ماں جس نے اپنے عیش و آرام کا خیال نہ کر کے بچے کو مڈل پاس کرایا، موہن کو افسردہ اور ملول نہ دیکھ سکی ـــــــ اس نے موہن کے خیالات معلوم کئے اور اس کو ڈھارس بندھائی ـــــــ وہ ادھر ادھر دوڑی دھوپی اور بالآخر شہر کے ایک اسکول میں داخل کرادیا ـــــــ فیس بھی معاف ہوگئی لیکن کھانے پینے کا خرچ کیسے چلتا؟ مجبوراً گھر کا اثاثہ بکنے لگا جب موہن نے ہائی اسکول پاس کیا تو گھر میں ایک لوٹے اور کٹورے کے علاوہ کچھ بھی باقی نہ رہا ـــــــ

آج شانتا کتنی خوش تھی ـــــــ آج اس کے موہن نے انٹرنس پاس کرلیا تھا اور پھر اول درجہ سے پاس کیا ـــــــ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ بیٹے کی آمد پر کیا رکھے اور کیا اٹھائے۔ کس طرح اپنے بچے کی خاطر کرے ـــــــ کس طرح اس کی خوشی کا سامان مہیا کرے، وہ بار بار اپنی بوسیدہ اور چاک چاک ساری کے آنچل کو چھپا رہی تھی کہ کہیں موہن کی نگاہ نہ پڑ جائے اور اس کے لئے رنج کا باعث ہو ـــــــ آج وہ لبِ ساحل کی مست اور خوش کن صبا کی طرح اِدھر اُدھر دوڑ رہی تھی ـــــــ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو رقصاں تھے ـــــــ وہ موہن کو بتانا چاہتی تھی کہ اس نے کس طرح یہ چند سال گذارے ہیں مگر الفاظ لبوں تک آ آ کر رک جاتے تھے ـــــــ وہ آنسوؤں کے گھونٹ پیتی چلی جارہی تھی ـــــــ "بھگوان کی پوجا کرو بھیا"، شانتا نے آنسوؤں کے سیلاب کو روکتے ہوئے کہا "جس کی دیا نے تم کو اس درجہ پر پہنچایا ہے ورنہ مجھ دکھیاری میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ تم کو پڑھا سکتی"

"ہاں ماں! موہن نے کہا اور طاق پر پڑے ہوئے گیروے پردے کو ہٹا کر

بھگوان کی مورتی کی پوجا کرنے لگا ——— وہ پوجا کرتا رہا اور جانے کب تک یہ پرستش جاری رہتی اگر شانتا کے پاؤں کی آہٹ اس کو چونکا نہ دیتی ——— آج اُس نے سچے دل سے بھگوان کی پوجا کی تھی ——— کوئی کیا جانے کہ آج اُس نے اتنی دیر تک بھگوان سے کیا پرارتھنا کی تھی لیکن شام کو وہ اپنی ماں سے کہہ رہا تھا "ماں میں بی اے کرونگا۔ کاش بھگوان اپنی کرپا سے مجھے بی اے کرا دیتے" ممکن ہے وہ اتنی دیر بھگوان سے یہی پرارتھنا کرتا رہا ہو۔

شانتا مصائب کے پیہم حملوں سے پریشان ہو چکی تھی ——— اب اس میں مزید دکھ برداشت کرنے کی ہمت نہ تھی اور اگر ہوتی تھی تو اب اس کے پاس ایک لوٹے اور کٹورے کے علاوہ باقی ہی کیا تھا ——— مگر پھر بھی وہ چاہتی تھی کہ اس کا موہن بی اے ہو جائے۔

چھٹیاں ختم ہونے لگیں اور موہن نے پھر وہی سوال دہرایا "ماں میں بی اے کرونگا"

ماں چپ تھی ——— وہ کہہ بھی کیا سکتی تھی ——— وہ خاموش رہی "میں ٹیوشن کر کے پڑھوں گا" موہن نے چند لمحوں کے بعد ماں کی فکر کو قدرے دور کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں بیٹا تم سے یہ نہ ہو سکے گا" وہ تیزی سے بولی "تم یوں ہی دھان پان ہو رہے ہو۔ ٹیوشن تمھارے بس کا روگ نہیں ہے"

"مگر اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے" وہ بولا "میں ٹیوشن کر کے اپنا خرچ پورا کروں گا اور باقی سب تم کو بھیج دیا کروں گا"

"نہیں بیٹا تم مجھ کو کچھ نہ بھیجنا" وہ بولی "میرا خرچ تو چلتا ہی رہتا ہے محلہ والوں کا آٹا پیس دیا کرتی ہوں۔ بھگوان کی دیا سے کھانے بھر کا مل ہی جاتا ہے"۔

"نہیں ماں!" وہ اشک آلود آنکھوں سے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "دیکھو تمھاری دھوتی کتنی پرانی ہو چکی ہے۔ اگر تمھارا خرچ چلتا رہتا تو تم دھوتی نہ خریدتیں ایسا کے میں تمھارے لئے ایک نئی دھوتی خرید لاؤں گا"

"نہیں میرے لال ابھی تو یہی کام دے رہی ہے۔ کیا کرو گے دوسری خرید کر" وہ خوش ہو کر بولی ——— اسے اپنے موہن سے ایسی ہی امید تھی ——— وہ بی اے کرلے گا ——— اور پھر ایک بڑا افسر ہو جائے گا۔ میں اس کے لئے ایک چاند سی بہن بیاہ لاؤں گی ——— میرا کھویا ہوا سکھ چین پھر پلٹ آئے گا ... ..." وہ اور نہ جانے کیا کیا سوچتی کہ موہن کی اچانک آواز نے اسے چونکا دیا۔

"تو ماں میں آج کے چوتھے روز چلا جاؤں گا"۔

"اتنی جلدی۔ بیٹا؟"

"ہاں ماں!" وہ بولا "داخلہ کے لئے جلدی پہنچنا ہے اور پھر ٹیوشن کی بھی فکر کرنی ہے"۔

آج موہن کالج جا رہا تھا۔ اپنے اجڑے ہوئے دیہات سے بہت دور اس کے قریب کے شہر میں کوئی کالج نہ تھا ——— پاس پڑوس کی کئی عورتیں شانتا کے گھر میں جمع تھیں۔ محض ہمدردی کی خاطر ——— کیوں کہ ہمدردی دکھے دلوں کے لئے تریاق کا کام دیتی ہے۔ موہن گھر سے چلنے لگا تو شانتا نے کہا کہ "بھگوان کی پوجا تو کر و بیٹا ——— جو کچھ ہے انھیں کا کرم ہے"

"اچھا ماں" موہن نے فرمانبردارانہ طور پر جواب دیا اور طاق میں رکھی ہوئی مورتی کے سامنے جھک گیا۔ وہ دیر تک سرنگوں رہا اور پھر ماتھے پر قشقہ لگا کر گھر سے اسٹیشن کی جانب چل دیا ——— موہن اپنی فکر میں سر جھکائے ہوئے چلا جا رہا تھا۔ اور رہ رہ کر اپنے ویران گھر کی طرف مڑ کر دیکھ لیتا تھا ——— شانتا اب تک دروازے پر کھڑی تھی ——— وہ آب دیدہ ہو گیا ——— "ماں کو کتنی محبت ہے مجھ سے" وہ سوچنے لگا مگر افسوس ہیں ان کو کچھ بھی آرام پہنچا نہ سکا ——— وہ کتنی دکھی ہیں مگر خیر یہ مصیبت کے دن بھی پورے ہو جائیں گے۔ بس چار سال اور ہیں۔

وہ ٹیوشن کر کے اتنا پیدا کر لیتا کہ ہر ماہ پانچ چھ روپے شانتا کو بھیج دیتا تھا مگر اسے کیا معلوم کہ اس کی ماں روپیوں کا کیا کرتی ہے ——— وہ اُن کو جوڑ جوڑ کر اپنی ہونے والی بہو کے لئے زیور بنوا رہی تھی ——— اس کی ساری کچھ اور بوسیدہ ہو چلی تھی اور اس میں پیوند اور بڑھ گئے تھے مگر اس نے نئی ساری نہ خریدی ——— اس کے چہرے کی جھریاں بڑھتی گئیں۔ لیکن کبھی اُس نے عمدہ کھانا نہ پکایا ——— چنے اور گڑ پر قناعت کرتی رہی ——— بہت کیا تو کسی دن ایک پیسہ کی گو بھی بہاٹ ڈال کر اُبال لی اور دونوں وقت کسی طرح کٹ گئے ——— اس کے بال روز بروز سفید ہوتے جا رہے تھے اور وہ چالیس برس کی عمر میں ستر برس کی بڑھیا معلوم ہوتی تھی ——— مگر اسے اپنی فکر نہ تھی ——— وہ تو کسی اور خیال میں مگن تھی ——— وہ اپنی سندر بہو کے لئے گہنا بنوا رہی تھی ——— ایک تو لڑکی والے جہیز کے پیچھے زیر بار ہوں۔ دوسرے لڑکے والے بھی گہنے کے لئے مقروض ہو رہے ہیں ——— آخر کیا پڑی تھی شانتا کو کہ اپنا پیٹ کاٹ کر بہو کے لئے گہنے بنوائے ——— مگر نہیں اس

کو اس کی ضرورت ہے۔ ہمارا سماج اس کو ایسا کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

دو سال بعد موہن ایف اے ہو گیا۔ گھر آیا تو شانتا بیمار تھی ـــــ اسے اپنے بچنے کی کوئی امید نہ تھی ـــــ وہ چاہتی تھی کہ اپنے سامنے موہن کا بیاہ کر دے مگر موہن راضی نہ ہوتا تھا۔ شانتا کی فکر روز بروز اس کو لاغر کرتی رہی۔ ـــــ اس کو صرف ایک فکر تھی ـــــ صرف ایک فکر ـــــ موہن کی برات کی فکر ـــــ اُس نے ایک روز موہن کو بلا کر بڑے مایوسانہ انداز میں کہا "بیٹا ایک بات ہماری مان لو۔"

موہن ماں کے قریب اور کھسک گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آخر ماں اس سے کون سی خاص بات کہے گی "بیٹا میری زندگی کے اب چند ہی دن اور ہیں۔" وہ کہنے لگی "میری سب سے بڑی آشا یہ ہے کہ بہو کا سندر مکھڑا دیکھوں ... ... کھوں ... ... کھوں ... ... کھوں ... ... کھانسی کی شدت میں اس کی آواز ڈوب گئی "بوڑھی ماں کی اتنی بات ... ... مان لو بیٹا ... ... کھوں ... ... کھوں ... ... کھوں۔

شانتا نے کچھ اس انداز سے التجا کی کہ موہن اس کی خوشی کو رد نہ کر سکا حالانکہ اسے اپنے اچھے برے کا خوب ہوش تھا۔ اُس نے ماں کی بات مان لی مگر وہ پریشان تھا اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر یہ ناؤ کیسے پار لگے گی؟۔

شانتا بیاہ کی بات پہلے پکی کر چکی تھی۔ صرف موہن کی رضامندی درکار تھی وہ بھی مل گئی ـــــ اس کی برات ہو گئی۔ وہ حیرت میں تھا کہ اُس کی ماں اتنا روپیہ کہاں سے لے آئی جو اس انداز سے برات کر ڈالی؟۔

آج اس کے گھر میں نئی نویلی کملا آگئی تھی ـــــــ وہ حسین تھی مگر اس کا حسن مفلسی کے شکنجوں میں جکڑا ہوا تھا۔ شانتا کی فکر بڑی حد تک دور ہوگئی ـــــــ موہن کی برات اس کے مرض کے لئے دوا سے بھی فزوں تر ثابت ہوئی ـــــــ مزید برآں یہ کہ کملا کی تیمارداری نے شانتا کو بہت جلد تندرست کر دیا ـــــــ مگر آہ ابھی موہن کے بی اے کرنے میں دو سال باقی تھے "کٹ جائیں گے یہ دو سال بھی کسی طرح" وہ سوچنے لگی۔

سال بھر بعد جب موہن گھر آیا تو کملا کی گود میں ننھا منا روہن کھیل رہا تھا ـــــــ وہ مسکرا دیا۔ شاید زندگی میں آج وہ پہلی بار مسکرایا تھا ـــــــ مگر پھر وہ اچانک لرز اٹھا ـــــــ اپنی مفلسی کے خیال سے، اپنی ناداری کے ڈر سے، وہ افسردہ ہوگیا اور اس کے ساتھ گھر بھر افسردہ ہوگیا ـــــــ آج اس کے گھر کے ارکین میں ایک کا اضافہ ہوگیا تھا اور اس کا ہاتھ بالکل خالی تھا ـــــــ "ہے بھگوان!" اس نے ایک آہ سرد بھرتے ہوئے کہا "تیرے بھید اب تک سمجھ میں نہ آئے۔ ہم غریب ہیں تو کیا، تیرے ہی بندے ہیں، ہم تیری سیوا ان لوگوں سے زیادہ کرتے ہیں جو اونچے اونچے محلوں میں روپے پیسے کے انبار میں لوٹتے ہیں اور مدتوں تو ندپر ہاتھ پھیرا کرتے ہیں۔ ہمارا خون چوس چوس کر یہ موٹے ہو جائیں اور ہم ایک ایک دانے کو ترسیں سچ کہا ہے کسی نے کہ غریبوں کا خدا نہیں ہوتا" ـــــــ

اس کی جیب بالکل خالی تھی ـــــــ مگر نہیں ـــــــ وہ جیب کو کسی مسرت کن انداز سے پھر ٹٹولنے لگا ـــــــ "ایک روپیہ ساڑھے چار آنہ" وہ ایک عجیب انداز سے گنتے ہوئے بولا ـــــــ "خیر بہت ہے"۔ مگر آخر یہ رقم کب تک

چلتی ــــــ چند یوم کے بعد پھر وہ بدستور مفلس تھا ـــــــ لیکن وہ حیرت میں تھا کہ گھر کا کاروبار کس طرح چل رہا ہے۔ دوراندیش کملا نے اپنا کچھ گہنا الگ کر دیا تھا اور گھر گرہستی کی گاڑی آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی ـــــــ

اس کی چھٹیاں ختم ہو گئیں ــــــ "ایک سال اور ہے ماں،" اس نے رخصت ہوتے ہوئے کہا "بس اب کے بیڑا پار ہے۔" "ہاں بیٹا! کہنے کو تو ایک سال ہے مگر میرے لئے یہ ایک ہزار برس سے بڑھ کر ہے۔ آنکھوں کی سوئیاں بڑی مشکل سے نکلتی ہیں۔" شانتا بولی ـــــــ

ایک سال اور گذر گیا۔ سر سے ایک پہاڑ ٹل گیا مگر اس پہاڑ نے ٹلتے ٹلتے کتنا نقصان کر ڈالا اس کو کوئی شانتا کے دل سے پوچھے۔ موہن نے بی اے پاس کر لیا ــــــ آج وہ بہت خوش تھی ــــــ میرے بھیا نے بی اے پاس کیا ہے "اول درجہ پاس کرنا معمولی بات نہیں ہے"۔ وہ اکثر فخریہ انداز میں پاس پڑوس کی عورتوں سے کہا کرتی "دیکھنا میرا لڑکا ڈپٹی کلکٹر ہوگا"۔ وہ کہتی اور عورتیں کہہ دیتیں کہ "ہاں ہاں کیوں نہیں!"

لیکن یہ ہوائی قلعے ٹوٹ گئے ــــــ وہ روز سویرے اٹھ کر بھگوان کی پوجا کرتا رہا اور بہت دیر تک ــــــ کون جانے کہ وہ اتنی دیر تک پوجا کیوں کرتا تھا ــــــ اب اس کی کیا آرزو تھی؟

آج وہ دو ماہ سے برابر ملازمت کے لئے دوڑ رہا تھا ــــــ اس کی بوڑھی ماں شانتا بیمار تھی جو کچھ دو چار روپے بچ رہے تھے وہ ماں کی نذر میں صرف ہو گئے۔ کملا کا گہنا ایک ایک کر کے گروی ہو گیا اور موہن کو پتہ تک نہ

چلا ——— وہ جب پوچھتا کہ گہنا کہاں ہے تو کہہ دیتی کہ بکس میں رکھا ہے ——— آج پھر اس کی جیب خالی تھی ——— ماں کا مرض بڑھتا جا رہا تھا ——— وہ پہروں تک پوجا کیا کرتا۔ بھجن گاتا اور ماتھے پر قشقہ لگا کر بی اے کی ڈگری جیب میں رکھ کر گھر سے نکل جاتا کہ شاید آج کہیں چار پیسے کا سہارا ہو جائے۔ ——— وہ دن بھر دفتروں کے چکر لگاتا ——— ہر جگہ درخواستیں دیتا پھرتا۔ لوگ اس کے قشقہ پر نگاہ ڈال کر کہہ دیتے "مہاراجہ آپ تو کسی مندر میں بیٹھ رہیے"۔ ——— اس کی معصومیت اور ہیئت پر بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوتا کہ "یہ سارٹیفکٹ کہیں سے چرا کر لے آیا ہے"۔ ——— ہر جگہ سے "نو ویکنسی" کا جواب پا کر اس کی کمر ہمت ٹوٹ جاتی مگر کوئی غیبی قوت اس کو برابر اُکساتی رہتی تھی ——— کہ بڑھتے رہو! دوڑتے رہو! یہاں تک کہ ایڑی چوٹی کا پسینہ ایک ہو جائے ——— ہونٹوں پر پپڑیاں جم جائیں ——— اور بدن تھک کر چور چور ہو جائے۔ یہ غیبی قوت ماں کی اطاعت تھی ——— یہی وہ روشنی تھی جو اس سے دربدر کی خاک چھنوا رہی تھی ———

اسی دوران میں بھگوان نے اس کو ایک اور بچہ دیا۔ شیام! اس کا نام تھا ——— یہ بھگوان کی عطا تھی یا یوں کہا جائے کہ بھگوان نے اس کی آزمائش کے لئے ایک اور پانسہ پھینکا ——— اس کی مفلسی میں تھوڑا اور اضافہ کر دیا ——— مصائب کی زنجیر تھوڑی اور بڑھا دی ——— مشکلات کی رسی میں ایک گرہ اور لگا دی ——— "بھگوان یہی تمہاری دیا ہے"، وہ زیر لب بڑبڑانے لگا۔ آج شیام کی پیدائش پر اُسے پہلی بار کچھ روپے ادھار لینا پڑے۔ جس راستے پر چلنے

سے وہ ہمیشہ احتراز کرتا رہا آج اُسی پر خود گامزن تھا۔ افکار کی بیڑیاں سخت تر ہو گئی تھیں۔

شانتا کی حالت بہت خراب ہو گئی ——— آج اور کل پر اس کے دن ٹلتے رہے ——— برسات کی تاریک اور ڈراونی راتیں تھیں ——— گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا ——— بادل کی گرج سے دل دہل رہا تھا اور بجلی کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں ——— شانتا کی حالت خراب ہوتی گئی ——— اور آخر کار ——— "بھگوان کی سیوا میں کمی نہ کرنا بیٹا" شانتا ایک آخری نصیحت کرتی ہوئی اس ناپاک دنیا سے سدھار گئی ——— "اچھا ماں"۔ موہن نے جواب دیا مگر شانتا اس کا جواب سننے سے پہلے ہی رخصت ہو گئی۔

بھگوان کی سیوا میں کمی نہیں ہوئی ——— بلکہ اور زیادتی ہوتی گئی ——— مگر ملازمت نہ مل سکی ——— جیب بدستور خالی رہی ——— شیام کی بری گت بن گئی ——— ڈیڑھ مہینہ کا بچہ اور اس پر یہ مصیبت! ——— وہ روز بروز سوکھتا گیا ——— اور آخر چند روز بعد بھوکا پیاسا اس گندی دنیا سے چل بسا ——— موہن کے دل پر ایک اور بجلی گری ——— ایک تازہ زخم لگا ——— ہر چند یہ پہلے سے زیادہ ہلکا تھا لیکن دیرپا ثابت ہوا ——— مگر وہ بی اے تھا اسے مایوس نہ ہونا چاہیئے ——— بھگوان کی پوجا میں کمی نہ کرنی چاہیئے۔ ایک نہ ایک دن نوکری مل ہی جائے گی ——— ادھر کملا شیام کی پیدائش کے روز سے ہی بیمار تھی ——— لیکن شانتا کی شدید علالت میں اس کا مرض دب گیا پھر شیام کے مر جانے سے اُسے بہت دکھ ہوا ——— وہ روز بروز سوکھتی جا رہی تھی

—— مگر پھر بھی وہ خوش تھی کیونکہ بھگوان کی مصلحت اسی میں تھی —— وہ ہر وقت بھگوان کے حضور میں دست بدعا رہتی مگر آہ بھگوان نے جیسے اس کی فریاد نہ سننے کی قسم کھالی تھی —— وہ بعض اوقات کڑھتی تھی مگر پھر بھی صبر کرتی تھی۔

موہن اب بھی ماں کی وصیت پر عمل کر رہا تھا —— مگر اب اس کی طبیعت اکھڑ چکی تھی —— "بھگوان ہماری کبھی نہیں سنتا" وہ اکثر کملا سے کہا کرتا اب اس کی عبادت میں خلوص نہ تھا —— وہ ابھی تک نوکری کے لئے دوڑ رہا تھا —— دو ایک جگہ سہارا لگا مگر وہاں تک رسائی ہوتے ہوتے جگہ بھر گئی اس کے پاس پیسے کہاں تھے جو راشی کلرکوں پر چڑھائے جاتے۔ اُس کے پاؤں میں آبلے پڑ گئے تھے۔ دن بھر کے بعد وہ گھر آتا تو ہونٹوں پر پیپڑیاں جمی ہوتیں اور ماتھے کا قشقہ پسینہ میں بہت کچھ بہہ چکا ہوتا —— مگر ابھی تک ایک پیسہ کا سہارا نہ تھا۔

ان کی زندگی کا واحد سہارا روہن تھا وہ بھی ماں باپ کی مصیبت میں برابر کا شریک تھا —— سب فاقہ سے ہوتے تو اسے بھی فاقہ کرنا پڑتا تھا۔ —— آہ اس کی معصوم جان کو کتنی اذیت پہنچ رہی تھی ——

ایک روز شام کو روہن کھیلتا ہوا دروازے کے باہر نکل گیا —— کملا کی مصیبت کچھ ہلکی تھی۔ حرارت کم تھی —— موہن ملازمت کی فکر میں گیا ہوا تھا —— کھیلتے کھیلتے روہن چبوترے کے کنارے پر پہنچ گیا —— اور ایک لمحہ میں نیچے پڑے ہوئے پتھروں پر جا پڑا —— دو سال کے بچے کا سر پھٹ گیا —— کملا کے سر پر اور تازہ مصیبت ٹوٹ پڑی —— مگر بھگوان کی کرنی

ایسی ہی تھی ـــــــ اس کی تقدیر میں ایسا ہی لکھا تھا ـــــــ بھاگوں کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔

چراغ جلے موہن واپس آیا ـــــــ روہن کی حالت دیکھی سر پیٹ کر رہ گیا ـــــــ وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ اس کے پاس وہ قوت نہ تھی جس سے ویدجی کو رام کیا جاتا اور پھر ابھی شانتا کی دوا کے دام موہن کے ذمہ باقی تھے۔ موہن کا بخار تیز ہوتا گیا۔ ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، .... پارہ برابر چڑھتا گیا ـــــــ کملا رونے لگی۔ مگر رونے سے زخموں کا اندمال ناممکن ہے۔ یکایک "بابو" اور "ماں" کی دردناک پکار ساکت فضا میں گونجی اور روہن کی معصوم روح پرواز کر گئی ـــــــ

ـــــــ کملا اور موہن ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے ـــــــ اور پھر دونوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کے کبھی نہ تھمنے والے سوت پھوٹ پڑے ـــــــ پرانے زخم ہی بھر نہ چکے تھے کہ تازہ جراحت کا مزہ چکھنا پڑا۔ یہ ناوک بہت گہرا اترا ـــــــ

ـــــــ "آہ بھگوان" موہن رو کر چیخنے لگا "کیا ہم غریبوں کو اسی لئے پیدا کیا جاتا ہے کہ زندگی بھر مصیبتیں اٹھاتے رہیں اور پھر مر جائیں۔ گویا ابتدا سے انتہا تک مصیبتوں کی بھرمار ـــــــ تجھے تو سب بڑا دیالو کہتے ہیں۔ کیا یہی تیری دیا ہے؟ کیا اسی طرح اپنے غریب داسیوں کے ساتھ سلوک کیا جاتا ہے ـــــــ وہ دیر تک جانے کیا کیا بڑبڑاتا رہا ـــــــ آخر کملا کی گریہ و زاری سے اس کا دل بھر آیا وہ کملا کو رونے سے باز رکھنا چاہتا تھا لیکن بہتے ہوئے دھارے کو موڑنا آسان کام نہیں ہے ایک تو وہ بیمار اس پر یہ صدمے! آخر وہ ایسی بیمار پڑی کہ جانبر نہ ہو سکی۔

کملا کی بیماری سے موہن بہت پریشان تھا ـــــــ اس کی ماں مر گئی

تو اس کو اتنا افسوس نہیں ہوا۔ اس کے دونوں بچے مرے تو بھی اس کو اتنا دکھ نہیں ہوا۔ لیکن آج اس کی رفیقِ زندگی ـــــ اس کی دکھ درد کی ساتھی ـــــ اس کی بیوی ـــــ اس کی کملا بیمار تھی ـــــ آج وہ بہت دکھی تھا ـــــ

جاڑوں کی برفیلی راتیں تھیں ـــــ بدن ٹھٹھرا جا رہا تھا ـــــ لیکن موہن نے کملا کے پاس بیٹھ کر صبح کر دی ـــــ صبح ہی صبح وہ کملا کے لئے دوا کی تلاش میں نکل گیا ـــــ وہ پھر دن تک مستقل دوڑ تا رہا۔ وہ اپنے آپ کو اس وقت بالکل بھول چکا تھا ـــــ اپنے بچوں کو بھول چکا تھا۔ ماں اور اس کی وصیت کو بھول چکا تھا، یعنی بھگوان کی پوجا کو بھول چکا تھا ـــــ اسے صرف کملا یاد تھی ـــــ صرف کملا ـــــ ویدجی کی خوشامد کرتے کرتے موہن تھک گیا ـــــ مگر ان کی نظر موہن کی جیب کی طرف اٹھتی ـــــ اس کا جائزہ لیتی اور اس کو خالی پاکر واپس آجاتی ـــــ

"پہلے اگلی دوا کے دام ادا کر دو پھر اور لے جاؤ" ویدجی نے نہایت عمدہ صورت پیش کرتے ہوئے کہا۔ وہ اپنے اس جملے کو بار بار دہرا رہے تھے۔ کملا بستر پر تڑپ رہی تھی اور موہن گھر سے باہر دوا کی تلاش میں دوڑ رہا تھا۔

"کہاں گئے؟ ـــــ ارے کہاں گئے ... ...کھوں ... ... کھوں ... ... کھوں ... ... ذرا سا ... ... پانی دے دو ... ... کھوں کھوں" ... ... اس کی آواز میں اضمحلال نمایاں تھا۔

"آہ! ... ... آہ!! ... ... کہاں گئے؟ ... ... ذرا سا ... ... پانی ... ... کھوں کھوں ... ... کھوں کھوں ... ...مگر وہاں

کون سننے والا تھا۔ پیاس کی شدت سے اس کا حلق خشک ہو کر گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی ـــــ اور رفتہ رفتہ سانسوں کی رفتار مدھم ہو گئی ـــــ پھر کچھ سانسوں کے اتار چڑھاؤ کے بعد ایک ہچکی آئی اور ایک لمحہ کے بعد بستر پر کملا کے بجائے اس کی سرد لاش ڈھیر تھی۔!!

وید جی کے پتھر دل کو پانی کرتے کرتے موہن کو شام ہو گئی ـــــ جب وہ آیا تو اس کے ہاتھ میں دوا کی پڑیا تھی ـــــ مگر جب مرض لا دوا ہو گیا تو تریاق لانے سے فائدہ؟ ـــــ آج وہ جی بھر کر رونا چاہتا تھا ـــــ مگر انتہائے غم سے اس کے آنسو خشک ہو گئے ـــــ اس کی آواز گلے میں پھنس گئی ـــــ

آج کئی روز بعد پھر اس نے بھگوان کی مورتی پر سے گیروا کپڑا ہٹایا لیکن آج اس کا سر خم نہ تھا ـــــ بلکہ وہ ایک عجیب شان سے مورتی کے سامنے کھڑا تھا، گویا انتقام لینا چاہتا ہو ـــــ اس نے مورتی کو نکال کر زمین پر پٹک دیا ـــــ اس کے ہاتھ پیر اور دیگر اجزا ٹوٹ پھوٹ کر الگ جا پڑے ـــــ موہن اپنی کامیابی پر ایک عجیب انداز سے مسکرا دیا ـــــ

آج اس نے بھگوان کے مجسمے کی تحقیر کی یعنی خود بھگوان کی توہین کی ـــــ آج وہ کتنا خوش تھا ـــــ آج اسے کسی کی فکر نہ تھی ـــــ اسے ماں اور بیٹوں کی فکر نہ تھی ـــــ بیوی کی فکر نہ تھی ـــــ اپنی فکر نہ تھی اور حد تو یہ ہے کہ بھگوان کی بھی فکر نہ تھی ـــــ آج اسے کسی چیز کی فکر نہ تھی ـــــ وہ ہر چیز سے بے نیاز تھا ـــــ وہ اپنی دھن میں بڑبڑا رہا تھا ـــــ "آج میری مصیبتوں کا خاتمہ ہو گیا ـــــ میں آزاد ہوں ـــــ بالکل آزاد ـــــ

ایک پرند کی طرح ——— میں مذہب کا باغی ضرور ہوں۔ میں نے بھگوان کی مورتی کی توہین ضرور کی ——— مگر بھگوان نے بھی تو میری تحقیر کی ——— مجھ کو غریب بنایا ——— مجھ کو ذلیل کیا ——— تیری عبادت ہم کریں اور تیری عنایت کے مزے دوسرے لوٹیں! کیا یہی ہے تیرا عدل؟ آج میں نے تیرے انصاف سے انحراف کیا ہے! تیری خدائی سے بغاوت کی ہے۔ میں باغی ہوں ——— ہاں باغی

وہ نجانے کب تک بڑبڑاتا رہا ———

چھپکلی

چھپکلی

اور پڑھتے پڑھتے یکایک اس کی نظریں سامنے دیوار پر بیٹھی ہوئی چھپکلی پر جا پڑیں ۔ کس قدر عجیب اور بدصورت ہوتی ہے چھپکلی بھی، وہ سوچنے لگا، دیکھ کر کتنی کراہیت معلوم ہوتی ہے، پھر اچانک اسے خیال آیا کہ دنیش کی نوکرانی بھی تو اتنی ہی بدصورت ہے۔ سیاہ جلد، چھوٹی چھوٹی بے نور سی آنکھیں، کبھی کبھی ہونٹوں پر ایک مردہ سی ہنسی ۔ میلے کچیلے کپڑے ۔ ہندوستان کے افلاس اور جہالت کی مکمل تصویر ـــــ اس کو دیکھ کر کتنی گھن لگتی ہے ـــــ وہ بھی تو بالکل چھپکلی کی مانند ہے ـــــ کتنی بے کیف اور سپاٹ ہے اس کی زندگی ۔ نہ کوئی زیر نہ بم، نہ موڑ نہ خم ـــــ صبح ہوتے ہوتے تمام گھر میں جھاڑو دینا، برتن مانجنا اور دیگر ضروری کام انجام دینا اس کے فرائض ـــــ اور بہت کیا تو کسی دن کھانا پکا لیا ورنہ عام طور سے تو کملا اپنے ہی ہاتھ سے کھانا پکاتی تھی ۔ اس کو ماما کے ہاتھ کی روٹی کبھی اچھی

ہی نہ لگی۔ جب کبھی وہ روٹی پکاتی کملا اس میں سینکڑوں برائیاں نکال دیتی۔ ماں نے روٹی پکائی اور اس کی شامت آئی ——

کملا کا خیال آتے ہی اس کے خیالات میں جیسے روانی آگئی —— وہ سوچنے لگا کملا بھی کتنی اچھی لڑکی ہے۔ پڑھنے میں تیز، بولنے میں تیز، کام کاج میں تیز، غرض کہ ہر بات میں تیز اور پھر حسین —— ابھی اس کی عمر ہی کیا —— ہوگی یہی کوئی چودہ پندرہ برس کی مگر اس عمر میں ہی وہ کتنی ذہین ہے۔ کالج میں نیچے درجے کے طلبا کو کوئی جانتا بھی نہیں —— لیکن وہ آٹھویں جماعت میں ہونے کے باوجود اپنی ذہانت اور حسن کی وجہ سے تمام کالج میں مشہور تھی۔

بیدی کی انگلیاں کتاب پر تھیں مگر اس کے تخیل میں کملا آباد تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ کملا سے اس کی پہلی ملاقات کب ہوئی تھی۔ اور اس کو یاد آیا کہ کالج کے سالانہ مشاعرہ کے دوسرے دن جب وہ کالج ہال کے قریب کھڑا ہوا تھا تو کملا اس کے پاس آئی تھی —— وہ دور افق کے پاس اڑتے ہوئے چڑیوں کے ایک حسین جوڑے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ نوں پرندے کبھی ایک دوسرے سے بالکل مل جائے اور کبھی دور ہٹ جاتے۔ ان کی معصوم حرکتیں بیدی کو بہت بھلی معلوم ہو رہی تھیں اور وہ ان کو محو اختلاط دیکھ کر قدرت کے نظام پہ زیرِ لب مسکرا رہا تھا۔

"مبارک باد بیدی صاحب آپ کو" اتنے میں پشت پر سے آواز آئی اور اس نے مڑ کر دیکھا تو کملا بغل میں کتابیں دبائے کھڑی تھی۔ اس نے ایک سرسری نظر کملا پر ڈالی اور دوبارہ پھر افق کی طرف تاکنے لگا تھا۔ مگر اب وہاں کچھ نہ تھا۔ وہ معصوم طائر اڑ کر کسی اور طرف چلے گئے تھے۔ اس کی نظریں ان کا تعاقب

کر کے ناکام لوٹ آئی تھیں ــــــــــــ

" واقعی آپ کی نظم بہت عمدہ تھی اور میں آپ کو اول انعام پانے پر مبارکباد پیش کرتی ہوں،" کملا نے عقیدتمندانہ جذبات کے تحت کہا تھا اور بیدی نے چاہا کہ کملا کی اس تعریف کا شکریہ ادا کرے مگر اس کو الفاظ نہیں مل رہے تھے ــــــــ بیدی یقیناً اس کے حسن سے متاثر تھا۔ اس نے کملا کو پہلی بار اتنی قریب سے دیکھا تھا۔ چہرہ پر ہلکا سا تبسم لیکن ساتھ ہی ساتھ سنجیدگی کی جھلک بھی۔

"آپ کو پسند آئی؟" اس نے ہمت کر کے کہا تھا۔

"کیوں نہیں!!" کملا نے جواب دیا تھا۔ اور پھر کئی منٹ تک سکوت طاری رہا۔

"اچھا!" وہ ایک خاص انداز سے بولی "ہسٹری کا گھنٹہ شروع ہو گیا ہے اجازت دیجئے۔ آداب عرض۔" اور اتنا کہہ کر وہ عجیب انداز سے بل کھاتی ہوئی کلاس کے اندر داخل ہو گئی۔ وہ اس کی سبک رفتاری کو دیکھتا رہا تھا گویا ایک ندی آہستہ آہستہ اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی ہو ــــــــــــ

اس کے بعد اس سے اور کملا سے اکثر ملاقاتیں ہوتی رہی تھیں۔ سائنس اور ہسٹری کے کلاس زیادہ دور نہ تھے۔ اکثر ادھر سے گذرتے ہوئے دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے سے مل جاتیں ایک برق سی کوند جاتی اور پھر دونوں کی آنکھیں جھک جاتیں۔

اور اکثر کملا نے اس سے نظم سنانے کی فرمائش کی مگر بیدی ٹالتا رہا۔ محض اس خیال سے کہ نظم سنانے کا کوئی موقع اور وقت اس کے پاس نہ تھا۔

—— مگر جب ایک روز کملا نے اس کو اپنے وہاں چائے پر مدعو کیا تو وہ شش و پنج میں پڑ گیا۔ کبھی وہ یہ سوچنے لگتا تھا کہ ایک جونیر کلاس کی لڑکی سے اتنی بے تکلفی اس کی شایان شان نہیں اور کبھی یہ کہ کملا کے والد کیا سوچیں گے۔ مگر آخر ؎

دل تابع کشش تھا کشش تابع جمال

اس نے وعدہ کر لیا۔ اور کالج کے اوقات ختم ہونے کے بعد کملا کے ساتھ ہی اس کے وہاں روانہ ہو گیا۔ مکان زیادہ دور نہ تھا۔ احاطہ میں داخل ہوتے ہی اس کو دروازے سے لٹکتا ہوا ایک پرانا سائن بورڈ نظر پڑا۔ اس نے بورڈ کے دھندلے الفاظ پڑھنے کی کوشش کی "دنیش چند اکسائز انسپکٹر"

کملا نے اپنے والد سے اس کا تعارف کرایا

"اچھا آپ ہی ہیں بیدی صاحب" وہ بولے "جن کو مشاعرہ میں اول انعام ملا تھا"

"جی ہاں! جی ہاں!!" کملا بول اٹھی

بالائی منزل پر چائے پینے کے بعد وہ سب ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے تھے۔ ان کی باتوں سے بیدی نے یہ معلوم کر لیا کہ کملا کی ماں اس کو بچہ چھوڑ کر ہی گور باش ہو گئی تھی۔ اور اب دنیش بابو کی زندگی کا واحد سہارا کملا تھی۔ کملا کے خیال سے انھوں نے دوسری شادی بھی نہ کی تھی۔ ورنہ وہ چاہتے تو اُلٹے پیغام ان کے پاس آتے۔ ایک تو نوجوان دوسرے برسرِ روزگار ——

"تو بیدی صاحب وہ نظم نہ سنائیے گا" دنیش بابو نے کہا "کملا بڑی تعریف کرتی تھی۔ میں بھی تو سنوں"

بیدی کو نظم یاد تھی مگر اس نے تکلفاً کہہ دیا کہ "نظم میرے پاس موجود نہیں اور اپنا کلام مجھ کو قطعی نہیں یاد رہتا۔ پھر کبھی سن لیجئے گا۔"

"بہتر ہے،" دنیش بابو اس انداز سے بولے گویا ان کو نظم نہ سن سکنے سے دکھ ہوا ہو۔

پھر وہی بے ہنگم سی گفتگو ـــــ جنگ ـــــ ہندوستان ـــــ بے کاری ـــــ کالج کی زندگی اور تعلیم کی موجودہ حالت ـــــ یہ سب موضوعات تھوڑی تھوڑی دیر بعد بدلتے رہے۔

"اب تو آپ سب کے امتحانات بھی قریب آ گئے ہوں گے ـــ؟" دنیش بابو نے پوچھا

"جی ہاں،" اس نے کہا اور اٹھنے کی خاطر دیوار پر لٹکی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھنے لگا۔

"امتحان سر پر آ گئے ہیں اور ابھی تمام کورس پڑا ہوا ہے" کملا دنیش بابو کی طرف رونی صورت بنا کر دیکھتے ہوئے بولی "آپ تو کچھ فکر ہی نہیں کرتے"

"مجھے خود خیال ہے بیٹی" وہ بولے "میں کسی معقول ٹیوٹر کی تلاش میں ہوں" اور پھر ایک لمحہ رک کر وہ بیدی سے پوچھنے لگے "آپ کے اختیاری مضامین کیا ہیں" "Mathematics اور Chemistry" اس نے کہا۔

"تو کملا!" دنیش بابو بولے "جب تک کوئی دوسرا ٹیوٹر نہیں ملتا تم بیدی صاحب سے کیوں نہیں پڑھ لیتیں" اور کملا عجیب التجا آمیز نظروں سے

بیدی کی طرف دیکھنے لگی۔ گویا کہہ رہی ہو "تیار ہو جایئے نا"

"کیوں بیدی صاحب ——؟" دنیش بابو سوالیہ انداز سے بولے

، مگر قبل اس کے کہ بیدی کچھ جواب دیتا کملا بیچ میں بول اٹھی "مگر ان کی پڑھائی کا نقصان جو ہوگا"

"آپ تو شاید پریویس ایر میں ہیں" دنیش بابو نے پوچھا

"جی ہاں میرا تھرڈ ایر ہے" وہ بولا

"پھر تو کوئی فکر کی بات نہیں"۔ وہ صوفے پر بڑے اطمینان سے بیٹھتے بلکہ لیٹتے ہوئے بولے۔ گویا ان کے سر سے بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔ اور پھر چند لمحے رک کر بولے "تو آپ اپنا تھوڑا سا قیمتی وقت کملا کو دے دیجئے۔ یہ تین ماہ تک بیمار رہی اس لئے امتحان کے لئے ذرا تیاری کی ضرورت ہے"

اور پھر کملا کی بوجھل پلکیں اس کی طرف اٹھیں۔ خاموش التجائیں اپنا کام کر گئیں۔ اور مجبوراً بیدی کو اقرار کرنا پڑا —— اس نے دیکھا کہ کملا کے چہرے پر مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔

"تو ماسٹر صاحب کل سے پڑھائی شروع کر ہی جائے" کملا نے شوخی کا نشتر چبھوتے ہوئے کہا

"جب چاہو" بیدی نے معمول سے زیادہ سنجیدہ بنتے ہوئے کہا "اچھا تو یہی ہے کہ کل ہی سے شروع کر دو۔ کیونکہ وقت کم ہے"

اور دوسرے روز سے وہ کملا کو پڑھانے لگا۔ بسا اوقات دنیش بابو بھی آ کر ان کی پڑھائی کا معائنہ کر جاتے مگر اکثر کملا کی کالی کلوٹی، چھپکلی جیسی نوکرانی

ہی کمرے میں موجود رہتی۔ اس کا نام سندری تھا ـــــ بہت زیادہ سندر تھی نا وہ ـــــ !! وہ اکثر ان دونوں کے قریب ہی زمین پر بیٹھ جاتی۔ اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دونوں کو دیکھتی رہتی۔ جیسے وہ دونوں کوئی برا کام کر رہے ہوں۔ بس ان دو کے علاوہ کملا اور بیدی کو کسی سے سابقہ نہ پڑتا تھا۔ عام طور سے وہ دونوں باہر کے کمرے میں تنہا ہی ہوتے تھے۔

کملا پڑھتی تو کم مگر باتیں زیادہ کرتی تھی ـــــ سائنس پڑھتے پڑھتے وہ جغرافیہ اور تاریخ کی باتیں پوچھنے لگتی۔ اور پھر شاعری کے نشیب و فراز میں کھو جاتی

"آپ ماسٹر صاحب اتنی اچھی شاعری کیسے کر لیتے ہیں" وہ پوچھتی۔ "سنا ہے جو لوگ دکھی ہوتے ہیں وہ زیادہ اچھی شاعری کرتے ہیں ـــــ آپ کی شاعری اتنی اچھی ہے تو کیا آپ بھی دکھی ہیں ماسٹر صاحب ـــــ !؟" وہ ایک ہی سانس میں نجانے کتنے سوالات کر ڈالتی۔ اور دیر تک جانے کیا کیا پوچھتی رہتی۔ مگر بیدی مصلحتاً اس قسم کے مباحث میں کملا کو الجھانا نہیں چاہتا تھا۔ جہاں اس نے اس قسم کے سوالات شروع کئے فوراً بیدی نے کہا: "ہاں! آگے پڑھو!!"

مگر کملا کو اس کا حل بھی معلوم ہو گیا۔ ایک روز جب بیدی نے اس کے سوالوں سے اکتا کر کہا: "آگے پڑھو" تو کملا نے کتاب بند کر دی ـــــ اور پھر وہی سوالات دہرانے لگی ـــــ "ماسٹر صاحب! آخر آپ میرے سوالوں کا جواب کیوں نہیں دیتے ـــــ ؟ آپ ہر وقت کھوئے کھوئے سے، غمگین سے کیوں نظر آتے ہیں ـــــ ؟ کیا آپ کو بھی ماسٹر صاحب کسی سے محبت ہے ؟"

اور بیدی اپنی کمزوری کے خیال سے گھبرا گیا۔ اس نے سوچا کہ اس کو کملا

کے سامنے کھویا کھویا نہ رہنا چاہیئے۔ مگر پھر اس نے ایک اور بات سوچی۔ اسے خیال آیا کہ کملا روز اسی قسم کے سوالات کرتی رہے گی۔ اس کو کوئی تشفی بخش جواب دے دینا چاہیئے۔ اور جب کملا نے اپنا سوال دوبارہ دہرایا تو اس نے کہہ دیا " ہاں میں نے محبت کی ہے "

اور اس نے دیکھا کہ کملا کے چہرہ کا رنگ جیسے اڑنے لگا ——— "کس سے"۔ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا

"یہ پوچھ کر کیا کرو گی" بیدی نے کہا

"کچھ نہیں!"

"پھر ؟"

"یوں ہی"

"اچھا تو سنو" بیدی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم سے۔!"

"سچ ———!؟" کملا نے اس طرح پوچھا گویا یہ کوئی ان ہونی اور ناممکن بات ہو۔

"ہاں کملا!" اس نے جواب دیا " بالکل سچ " ——— اور اس نے دیکھا کہ کملا کے چہرے پر ایک خاص رنگِ حیا دوڑ گیا ——— اس کے دمکتے ہوئے گال اور زیادہ سرخ ہو گئے اور اس کا سینہ دھڑکنے لگا۔ وہ اٹھ کر اندر بھاگنے لگی۔

"کہاں چلیں ———؟" بیدی نے پوچھا

"اب کل پڑھوں گی" وہ بولی اور دزدیدہ نگاہوں سے اس کو دیکھتی ہوئی اندر چلی گئی۔

اور اس روز کے بعد کملا اس سے قریب تر آنے لگی تھی۔ پہلے تو وہ کمرے میں بیدی کے پہنچنے کے بعد جایا کرتی تھی مگر اس روز سے وہ بیدی کو ہمیشہ باہری کمرے میں محوِ انتظار ملنے لگی ـــــ اور بیدی کا دل بھی کالج سے اچاٹ ہونے لگا۔ وہ یہی سوچتا رہتا تھا کہ کب چھ بجیں اور وہ کملا کو پڑھانے جائے ـــــ دنیش بابو بھی بیدی سے بہت خوش تھے کیونکہ وہ پڑھانے میں کبھی غیر حاضر نہ ہوتا تھا۔ اور مقررہ وقت سے اکثر زیادہ ہی پڑھا دیا کرتا تھا۔ خود غرض دنیا کو چاہیئے بھی یہی۔ اب بیدی ان لوگوں سے اس قدر گھل مل گیا تھا کہ ان کے ہی خاندان کا ایک فرد معلوم ہونے لگا تھا۔

ایک دن شام کو بڑے زور کی بارش ہو رہی تھی۔ چھ بج رہے تھے اور پانی رکنے کا نام نہ لیتا تھا۔ وہ اپنے معمول میں فرق نہ آنے دینا چاہتا تھا اور پانی کہتا تھا کہ آج برس کر پھر نہ برسوں گا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ پڑھانے جانا چاہیئے اور آخر کار وہ دل کا کہنا مان کر اٹھ کھڑا ہوا۔ بوندیں تھمنے لگی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ چند منٹ میں بارش بالکل تھم جائے گی لیکن جب وہ اپنے مکان سے تھوڑی دور نکل آیا تھا تو بارش پھر تیز ہو گئی ـــــ مگر اس نے لوٹنے کا ارادہ نہ کیا۔ وہ تیزی سے بڑھتا گیا ـــــ راستے خراب تھے ـــــ سڑک کے کنارے پانی سے لبریز تھے۔ آس پاس کوئی انسان نہ دکھائی دے رہا تھا۔ کوئی اس کی طرح پاگل تو نہ تھا کہ پانی برستے میں نکل کھڑا ہو ـــــ مگر وہ چلا جا رہا تھا ـــــ چلا جا رہا تھا۔ اپنے دل کے کہنے پر عمل کرتا ہوا

اور جب وہ بھیگتا ہوا دنیش بابو کے احاطہ میں داخل ہوا تو وہ برآمدہ میں

کھڑے پانی کا سماں دیکھ رہے تھے ــــــ ان کو بیدی سے ہمدردی تھی۔ وہ اس حرکت پر برہم بھی ہوئے۔ بالکل اس طرح جیسے ایک بڑا اپنے چھوٹے پر ناراض ہوتا ہے۔ مگر بیدی نے ان کی ناراضگی پر کوئی توجہ نہ دی ــــــ وہ ڈرائینگ روم میں چلا گیا ــــــ چونکہ کملا کو اس بارش میں بیدی کے آنے کی امید نہ تھی لہذا وہ پڑھنے کے کمرے میں پہلے سے موجود نہ تھی ــــــ دنیش بابو نے اندر جا کر کملا کو بھیجا ــــــ

"آخر اس بارش میں آپ نے کیوں تکلیف کی؟" کملا نے آتے ہی سوال کیا

"تکلیف!" وہ بولا "ارے یہ تکلیف کہاں ہوئی ــــــ یہ تو ــــــ"

وہ کچھ کہنے جا رہا تھا مگر رک گیا ــــــ اور پھر بات بنانے کی غرض سے بولا "بات یہ ہے کملا کہ تمہارے امتحان کے چند ہی دن باقی ہیں ــــــ اور ابھی کافی کورس ختم کرنا ہے ــــــ محض اسی خیال سے میں چلا آیا"

"واہ!" کملا نے کچھ احسانمند اور کچھ محبت بھری نظروں سے جن میں اپنائیت کی جھلک تھی، دیکھتے ہوئے کہا "امتحان ہوتا یا نہ ہوتا۔ آپ کو اس بارش میں قطعی نہ آنا چاہیئے تھا"

"ہاں دل نہیں مانا" وہ بولا

"اچھا آپ کا دل ہے" کملا نے جھکی ہوئی نظروں سے کہا "جو اس بارش میں پڑھانے پر مجبور کرتا ہے"

"ہاں ایسا ہی دل ہے میرا" اس نے صوفے کی ٹیک لیتے ہوئے کہا۔ اتنے میں دنیش بابو نے چائے بھجوا دی۔ بیدی نے چائے پینے کے بعد کچھ سکون محسوس کیا۔ وہ بارش میں بری طرح بھیگ گیا تھا۔ اس نے خود کو ایک

گرم چادر میں اچھی طرح لپیٹ لیا۔ اسے حرارت سی ہو گئی تھی اور بدن میں کپکپی شروع ہو گئی تھی ——————

"آپ کو بخار معلوم ہوتا ہے"، کملا نے بیدی کا ہاتھ چھوتے ہوئے کہا

"ہاں کچھ یوں ہی سی حرارت ہو گئی ہے"، بیدی نے کہا

"آپ کا تو سارا بدن آگ ہو رہا ہے"، کملا نے کہا اور الماری سے کوئی دوا نکال کر اس کو پلا دی۔ اس نے بغیر پس و پیش کے دوا کا تلخ گھونٹ حلق سے نیچے اتار لیا۔

"آپ کو تیز بخار ہے"، کملا کہنے لگی "آپ مسہری پر لیٹ رہئے اور سو جائیے۔ میں آج نہیں پڑھوں گی ——————"

"نہیں! کچھ تو پڑھ ہی لو"، بیدی نے کہا۔

"جی نہیں! بالکل نہیں!!" وہ بیدی کے لئے بستر پر چادر بچھاتے ہوئے بولی۔

بیدی فرمانبردارانہ طور پر مسہری پر تکیہ کی ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اور کملا بھی اپنی کرسی اُس کے قریب ہی لا کر بیٹھ گئی ——————

"اب آپ لیٹ جائیے!!" وہ بولی "ورنہ کہیں طبیعت گڑبڑ نہ ہو جائے"،

"ہاں لیٹ رہونگا"

"نہیں لیٹ رہئے اور سو جائیے"،

"نیند نہیں آ رہی ہے"

"اچھا آنکھیں بند کر لیجئے۔ ابھی نیند آتی ہے"

اور بیدی نے یوں ہی آنکھیں بند کر لیں۔ مگر نیند کہاں۔ چند منٹ بعد کملا نے پوچھا "سو گئے؟"

وہ جاگ رہا تھا مگر خاموش رہا ——

"اچھا ابھی تو نیند نہیں آ رہی تھی" وہ بولی "اور اب اتنی جلد سو بھی گئے"۔

اور اس کے بعد دروازہ بند کرنے کی آہستہ سے آواز آئی —— بیدی آنکھیں بند کئے تھا۔ وہ سمجھا شاید کملا چلی گئی —— مگر ایک لمحہ میں اس نے محسوس کیا کہ کملا اس کی مسہری پر بیٹھ گئی —— اور اس کا گرم گرم تیز تیز تنفس فضا کے سکوت کو توڑ رہا تھا —— بیدی کے دل میں دبی ہوئی ایک آرزو بیدار ہوئی اور اس نے چاہا کہ کملا کو آغوش میں لے کر دوستی کی مہر ثبت کر دے ——

کہ اتنے میں دروازہ کھلنے کی آواز آئی ——

"بابو جی بلا رہے ہیں بٹیا" وہی کالی کلوٹی سنداری سامنے کھڑی کہہ رہی تھی۔

غصہ اور شرم سے بیدی کا برا حال تھا۔ اس کا جی چاہا کہ اٹھ کر سندری کا گلا دبا دے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو ——

"ظالم! منحوس!! جیسے دیوار ہی سے لگی کھڑی ہو —— چھپکلی کہیں کی"۔ وہ زیر لب بڑبڑانے لگا ——

کتاب اس کے ہاتھوں میں اب تک جامد و ساکت پڑی ہوئی تھی اور

سامنے کی دیوار پر بیٹھی ہوئی چھپکلی اس کی طرف عجیب خشمگیں نظروں سے دیکھ رہی تھی

"چھپکلی" — اس نے ایک دفعہ جل کر کہا اور پھر خود ہی اپنی بے وقوفی پر مسکرا دیا ——

سزا

سزا

ترشح ہو چکا تھا ــــــ گردوپیش کا ذرہ ذرہ دھلی ہوئی نکھری ہوئی چاندنی میں چمک رہا تھا ــــــ تمام کائنات پر ایک خود رفتگی کا عالم طاری تھا ــــــ سامنے کے مندر کا کلس چاندنی کے نور سے جگمگا رہا تھا ــــــ ہم دونوں مسہری پر لیٹے ہوئے چاندنی کا لطف اٹھا رہے تھے۔ قریب کی میز پر ریڈیو رکھا ہوا تھا ــــــ کوئی دھیمی سروں میں گا رہا تھا

یہ چاندنی ، یہ جوئبار
نفس نفس ہے خوشگوار

"بند کر دیجیے اس کو" بیگم نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا

واقعی اس پر سکون چاندنی کا لطف ریڈیو کی کھرر ــــــ کھرر سے کرکرا ہو رہا تھا۔ میں نے خود ریڈیو بند کرنا چاہا تھا مگر اس خیال سے کہ بیگم سن رہی ہیں بند

نہ کیا تھا اور آخر کار وہ بھی اس بے وقت کی راگنی سے اکتا گئیں —— قریب کی چھوٹی میز پر چاندی کا منقش پاندان رکھا ہوا تھا جو اس چاندنی میں پوری طرح چمک رہا تھا۔ پاس کے چمن سے چمپا کی عطر بیز اور مست کن خوشبو تمام فضا کو بے خود بنا رہی تھی۔ ہوا کے ہلکے ہلکے شریر جھونکے عذرا کی نرم ریشمیں زلفوں سے کھیل رہے تھے۔ چاند کا روشن ہالا ایک عجیب کیف انگیز سماں پیش کر رہا تھا —— بڑا نشاط انگیز اور سرور افزا سماں تھا۔ روح کی گہرائیوں میں مسرت کی خلش انگیز لہریں اٹھ رہی تھیں ——

میں نے عذرا کا نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ لیکن اب تک ہم دونوں اسی طرح چاند کے دیکھنے میں کھوئے ہوئے تھے۔ میں اس کی نازک چوڑیوں کو اس کی حسین کلائی کے گرد گھمانے لگا —— ہم دونوں چاند کے حسین منظر میں بالکل کھوئے ہوئے تھے کہ بیگم نے ایک ہلکی سی آہ بھری ——

"کیا ہوا عذرا —— ؟" میں نے پوچھا

"کچھ نہیں!" وہ بولی

"پھر یہ آہِ زیر لب کیسی —— ؟" میں نے اصرار کیا

"کچھ بھی تو نہیں" بیگم نے بالوں کو اپنے چاند سے ماتھے سے سمیٹتے ہوئے کہا "کوئی خاص بات نہیں"

"آخر عام بات ہی سہی" میں نے پھر کہا

"ارے بھئی کچھ نہیں" انھوں نے قدرے جھنجھلاتے ہوئے کہا "تم تو خواہ مخواہ ایک بات کے پیچھے پڑ جاتے ہو"

"نہیں تم کو بتانا ہی ہوگا کہ یہ آہ کیوں بھری گئی" ، میں نے ضد کی

"ارے کوئی بات ہو تو بتاؤں بھی ـــــ" وہ صفائی پیش کرنے لگیں

ـــــ "بس یونہی ـــــ اسی طرح ـــــ چاندنی کے اثر سے ـــــ" وہ بات پوری نہ کر سکیں

"ہاں ہاں کہو!"

"ارے کچھ نہیں" وہ کچھ شرما سی گئیں ـــــ

"اچھا کچھ نہیں تو جانے دو" ، میں نے مصالحت کرتے ہوئے کہا ۔ اور پھر ہم دونوں خاموش ہو گئے ـــــ میں بیگم کے انداز سے کچھ بھانپ گیا تھا مگر محض اس خیال سے کہ وہ کہیں بُرا نہ مان جائیں چپ ہو رہا ـــــ بہت دیر تک ہم دونوں خاموش لیٹے ہوئے چاند کی طرف دیکھتے رہے ۔ چاند بدستور ہنس رہا تھا ـــــ

"ایک بات بتاؤ!" ، میں نے اُن سے کہا : "بتاؤ گی ؟"

"پوچھئے" وہ بولیں

"مگر دیکھو سچ سچ بتانا" ، میں نے کہا : "ورنہ تم کو 'سزا' دی جائیگی"

"کیا سزا ـــــ ؟"

"یہ پہلے سے کیوں بتا دوں"

"اچھا بات پوچھو!"

"ہاں!" میں نے ذرا رک کر کہا : "تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے ؟"

"محبت!" انھوں نے ایک طنزیہ مسکراہٹ سے اس لفظ کو ادا کیا

ـــــ "محبت!!"

"ہاں ہاں محبت!" میں نے زور دے کر کہا۔ "تم مسکرانے کیوں لگیں؟"

"اس لئے کہ محبت ہنسنے ہی کے قابل ہے" وہ بولیں

"محبت ہنسنے کے قابل ہے ــــ!؟" میں نے حیرت سے سوال کیا

"یعنی ــــ؟ ــــ تمہارا مطلب میں نہیں سمجھا ــــ"

"اچھا ہمارا مطلب کچھ ہو" وہ گویا ہار مانتی ہوئی بولیں۔ "پہلے یہ بتائیے کہ آپ نے کسی سے محبت کی ہے؟"

"نہیں! پہلے میں نے پوچھا ہے اس لئے پہلے تم ہی بتاؤ!" ـ میں نے کہا۔

"اچھا بتاؤں ــــ؟" وہ ایک عجیب بھولپن کے انداز سے بولیں۔ "مگر آپ یقین نہ کیجئے گا ــــ!"

"واہ یہ کیا بات ہوئی" میں نے کہا۔ "یعنی تم کہو اور میں یقین نہ کروں!"

"اچھا تو پھر نہیں کہتی"

"نہیں تم کو کہنا پڑے گا"

"تو پھر آپ ــــ"

"اچھا بھئی کسی طرح کہو بھی!"

"کیسے کہوں ــــ شرم لگتی ہے" وہ عجیب معصومانہ انداز سے کہنے لگیں۔

"اس میں شرم کی کون بات ہے" میں نے کہا۔ "محبت گناہ تو ہے نہیں!"

"اچھا سنو!" وہ مستقل چاند کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں "ہمارے چچازاد بھائی ہیں نا——؟"

"کون——؟ مظہر!"

"ہاں وہی!"

"اچھا کہو"

"تو میں ان کی بڑی قدر کرتی تھی" وہ گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے بولیں "مگر وہ—— آہ وہ مجھ سے ہمیشہ——" وہ رک گئیں

"کہو! کہو چپ کیوں ہو گئیں——؟"

"نہیں!—— اب نہیں کہنی"

"تو پھر تم کو سزا ملے گی"

"کیا سزا——؟" انھوں نے پوچھا۔ "کیا سزا دیجیے گا آپ——؟"

"جو میرا جی چاہے گا"

"اچھا تو میں سزا بھگتنے کے لئے تیار ہوں" انھوں نے کہا "مگر مجھ سے کچھ پوچھیے گا نہیں—— کیا پان بنانے کی سزا ہے؟"

"جی نہیں!"

"پھر——؟"

"میری طرف دیکھو"

عذرا نے میری طرف کروٹ بدل لی۔ میں نے اسے اپنے بازوؤں میں لیا—— اور اس نے ایک ہلکی سی مزاحمت کی جس میں سپردگی کا انداز تھا

——— اور پھر میں نے اس کے حسین اور شفق رنگ لبوں سے ایک جام پی لیا ———

"اونھ!" وہ بولیں: "یہ کیا حرکت ہے؟"

"سزا" میں نے کہا

"بڑے وہ ہیں آپ!"

"اور تم بھی تو "

چاند ہم دونوں کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا

حسین دھوکا

حسین دھوکا

"...... ... میں آخر میں آپ سے پھر کہوں گا کہ ہندوستان کی آزادی خطرے میں ہے۔ اسے آپ لوگوں کی امداد کی سخت ضرورت ہے ... ... جب تک ہندو اور مسلم بھائی بھائی نہ ہو جائیں گے ہندوستان آزاد نہ ہو گا ... ..."

اس کی آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ وہ کھانستا ہوا لاؤڈ اسپیکر کے سامنے سے ہٹ آیا۔ تمام پنڈال میں تالیوں کا شور مچ گیا۔

وہ ایک غریب مگر مخلص لیڈر تھا۔ جذبۂ وطنیت سے بھرپور اور آزادی کا خواہاں۔ وہ نوجوان تھا۔ اسے بی اے پاس کئے ہوئے ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا۔ لیکن ان ہی چند سال کے عرصے میں اس نے شہر میں کافی عزت حاصل کر لی تھی۔ شہر میں کوئی جلسہ ایسا نہ ہوتا تھا جس میں وہ بلایا نہ جاتا ہو۔ آج بھی اسی طرح کا ایک قومی جلسہ تھا۔ اس کی تقریر سب سے زیادہ پسند کی گئی تھی۔

چند روز بعد شہر کے مشہور سیٹھ کندن لال جی نے بھی اسی قسم کا ایک جلسہ کرایا۔ شاید اس لئے کہ لوگ اُن کو بھی قوم کے خادموں میں شمار کرتے رہیں اور ان کی شہرت اور عزت میں اضافہ ہوتا رہے۔ نوجوان لیڈر اشوک بھی مدعو تھا۔ جلسے میں ایک گھنٹہ کی دیر تھی اور اشوک نے سوچا کہ ابھی تو پنڈال ہی سج رہا ہے۔ اتنی دیر تک سیٹھ صاحب ہی کے وہاں بیٹھا جائے۔ وہ ان کی کوٹھی کی طرف چلدیا۔ سیٹھ جی اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ اشوک کو دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور پر تپاک خیر مقدم کیا۔ اشوک اس وقت یہ سوچ رہا تھا کہ اس کی قومی خدمات نے، اس کی تقاریر نے اس کو کتنا معزز بنا دیا ہے سیٹھ جی نے کوئی گفتگو چھیڑ دی اور بات ہی بات میں ہندوستان کی آزادی کا ذکر چھڑ گیا سیٹھ جی پر اپنی لیاقت اور قابلیت کا سکہ بٹھانے کے لئے اس نے جلسہ کے لئے تیار کی ہوئی تقریر کا کچھ حصہ اُگل دیا۔ سیٹھ جی اس کی تقریر اور خیالات سے بہت متاثر ہوئے۔ ان کے دل میں اس وقت اشوک کے لئے بہت جگہ تھی۔ عقیدت کے شدتِ جذبہ کے تحت وہ کہہ اٹھے "دیکھئے میں آپ کو اپنی لڑکی کملا سے ملاتا ہوں وہ آپ سے مل کر بہت خوش ہو گی ـــــ کملا! ـــــ او کملا!!" سیٹھ جی نے پکارا۔

"آئی بابو جی" ایک شیریں اور ملائم آواز اشوک کے کانوں میں گونج گئی وہ اپنے تصور کے سہارے کسی اور دنیا میں پہنچ گیا۔ دروازے پر پڑے ہلکے ریشمی پردے کو ہٹا کر کملا کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کی مستی بھری آنکھیں اٹھیں اور اشوک کی نظروں سے ٹکرا کر جانے کیوں جھک گئیں۔ سیٹھ جی نے دونوں کا تعارف کرایا

کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر سیٹھ جی جلسے میں چلنے کی خاطر تیار ہونے کے لئے اندر چلے گئے۔ ایک بار پھر اشوک اور کملا کی نگاہیں ملیں اور جھک گئیں دونوں کے چہروں پر سوچ کے آثار نمایاں تھے۔ دونوں سوچ رہے تھے کہ انھوں نے ایک دوسرے کو کب اور کہاں دیکھا ہے ـــــــ اور آخر کار کملا کو یاد آگیا۔

"شاید ہم دونوں کی ملاقات کالج میں ہوئی تھی،" وہ بولی "شاید نہیں بلکہ یقیناً! اف کتنے کیف انگیز تھے وہ لمحات ــــــ وہ جنت بدوش ساعتیں مگر چند ہی ماہ بعد مجھے کالج کی گود سے چھین لیا گیا تھا"

اشوک نے بھی اپنے حافظہ پر زور دیا اور اسے یاد آیا کہ ہاں کملا نام کی کوئی لڑکی کالج میں پڑھتی تو تھی۔ اور پھر چند ہی ماہ بعد اس کا نام پھر کبھی نہ سنائی دیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس وقت تو اس میں کوئی بھی جاذبیت نہ تھی مگر اس وقت تو عالم ہی اور ہے ... ! وہ اور نہ جانے کیا کیا سوچتا کہ کملا نے اس کی ذہنی دنیا میں ہیجان بپا کر دیا۔

"کیا سوچ رہے ہیں آپ؟" اس نے پوچھا

"کچھ بھی نہیں،" اس نے کہا۔ مگر اس کے تصور کے تمام محل چکنا چور ہو چکے تھے۔ اور وہ کہتا بھی کیا۔ اور اس نے اس سوچ کے لئے عذر تراشا "کچھ نہیں یہی سوچ رہا تھا کہ سیٹھ جی اب تک اندر سے تشریف نہیں لائے اور جلسے کا وقت قریب آگیا ہے،"

"آتے ہی ہوں گے،" کملا نے کہا "آپ اتنی دیر سے یہی سوچ رہے تھے؟ کیا بات ہے؟"

"کچھ بھی تو نہیں!" اشوک نے اپنے دلی جذبات کو چھپاتے ہوئے کہا۔
"دیکھئے ذرا اندر جا کر سیٹھ جی کو یاد دلا دیجئے کہ جلسے کا وقت قریب آچکا ہے"
"بہتر ہے" کملا نے کہا اور کمرے سے ایک ستائی ہوئی تتلی کی طرح نکل گئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اشوک کا دل پتھر ہے۔

جلسے میں اشوک کی تقریر حسب معمول بہت کامیاب رہی۔ سیٹھ جی اس کی تقریر سے اتنا متاثر اور خوش ہوئے کہ اس کو شام کو چائے پر مدعو کر لیا۔
"اس کی کیا ضرورت ہے" اشوک نے انکار کرتے ہوئے کہا مگر سیٹھ جی نہ مانے اور آخر اشوک کو وعدہ کرنا پڑا ——— ایک بار پھر اشوک کو اپنے مکان پر دیکھ کر کملا بہت خوش تھی۔ لیکن اس کے چہرے سے ایسا ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ ناراض ہو۔ روٹھی ہوئی ہو۔ وہ چپ چپ سی تھی اور یہی حال اشوک کا تھا لیکن بات کرنے اور ملنے کی آرزو دونوں کی آنکھوں میں جھلک رہی تھی۔ اتنے میں سیٹھ جی سے ملنے کوئی صاحب آگئے اور وہ دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ اشوک اور کملا کو تخلیہ ملا۔ لیکن دونوں مہر بہ لب بیٹھے رہے۔
صبح کی پیش قدمی نے کملا کی ہمت توڑ دی تھی۔ نہیں، نہیں!! وہ جھک کر کبھی نہیں مل سکتی۔ اس نے ارادہ کر لیا تھا۔ کمرے میں مسلسل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ جیسے ایک ساکت سمندر ——— نہ لہروں کا شور ——— نہ موجوں کی چیخ پکار۔ جیسے سمندر دن بھر کی ہلچل سے تھک کر چور ہوگیا ہو ——— اشوک نے اپنی نظریں کملا کے چہرے پر جما دیں۔ کملا غیر شعوری طور پر میز پر پڑی ہوئی کتاب کے

زرق الٹنے لگی۔ مگر اس میں اسے دلچسپی نہ ہوئی۔ اس کے جذبات میں ہیجان تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ مگر خاموش تھی۔ اس کی حالت ستار کے خاموش تاروں کی طرح تھی کہ ؎

اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

آخر وہ ضبط نہ کر سکی۔ جذبات کا سمندر امنڈ پڑا۔ خشک آنسوؤں کے دھارے بہ نکلے۔ آواز اس کے گلے میں پھنس گئی۔ آخر وہ ہمت کر کے بولی "آپ مجھ سے نفرت کرتے ہیں؟"۔ اشوک بھی خود بخود کملا کی طرف کھنچ رہا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ اس افسانہ کا انجام المیہ ہوگا۔ اس لئے اس نے بیکار سمجھا کہ اس سلسلے میں وہ کوئی قدم اٹھائے۔ اس نے اپنے جذبات کو چھپاتے ہوئے کہا: "میں کسی سے نفرت نہیں کرتا"۔

"تو پھر اس بے رخی کی وجہ؟" کملا نے پوچھا۔ اب اشوک سے بھی ضبط نہ ہو سکا۔ وہ کہنے لگا۔

"اس کی وجہ یہ ہے کہ میں خود کو تمہارے قابل نہیں سمجھا۔ تم پھولوں کی آغوش میں پلی بڑھی ہو کانٹوں کی وادی میں ایک لمحہ بھی رک نہیں سکتیں۔ تمہارے یہاں ایک اشارے پر بیسیوں خادم کمر بستہ رہتے ہیں۔ لیکن میں اپنے گھر میں خود ہی آقا ہوں اور خود ہی خادم۔ تم امیر اور میں غریب۔ بھلا امیر اور غریب کا جوڑ ہی کیا؟ میرا اور تمہارا نباہ مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ میرے وہاں تم کو تمام کام خود کرنا ہوگا۔ تمہارے ہاتھ شل ہو جائیں گے۔ پھول سے رخسار زرد پڑ جائیں گے۔ زندگی میں عیش و عشرت حاصل کرنا تو در کنار میرے ساتھ رہ کر کشاکشِ حیات تم کو اتنی بھی

مہلت نہ دے گی کہ تم یہ سوچ سکو کہ زندگی ہے کیا۔ دیکھو کملا جان بوجھ کر انجان نہ بنو! دہکتی ہوئی آگ کو پھولوں کا ڈھیر سمجھ کر اس میں ہاتھ نہ ڈالو۔ ان کو غور سے دیکھو! یہ دہکتے ہوئے انگارے ہیں جو تمھارے نازک جسم کو جھلس دیں گے۔ تم دیکھ رہی ہو کہ کشتی کے تختے ٹوٹے ہوئے ہیں۔ طوفان تیز ہے۔ آندھیاں چل رہی ہیں۔ ناخدا تک مایوس ہے۔ اس پر بھی تم اسی کشتی میں سفر کرنے پر مصر ہو۔ یہ کہاں کی دانائی ہے؟"

"کچھ بھی ہو" کملا نے میز پر پڑی ہوئی کتاب کے چکنے سرورق پر اپنی نازک انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا: "میں اس گھر میں ایک قیدی کے مانند ہوں۔ ایسا قیدی جس کو فریاد کرنے کی بھی اجازت نہیں۔ میں ایسی دنیا چاہتی ہوں جہاں میرے اور تمھارے علاوہ کوئی نہ ہو ـــــ میں جی بھر کے ہنس سکوں، بول سکوں اور خوش رہ سکوں۔ گھر پر مجھے ہر طرح کی مسرتیں حاصل ہیں۔ مگر یہ احساس کہ میں اس چہار دیواری میں بند ہوں کتنا روح فرسا ہے۔ یہ تنہائی، افسردگی اور مایوسی ! در و دیوار جیسے کاٹے کھاتے ہوں۔ نہ کوئی مونس نہ رفیق۔ میں ہر مشکل برداشت کر سکتی ہوں بشرطیکہ اس قیدِ سخت سے رہائی پاؤں۔ بولو مجھے اپنے ساتھ لے چلو گے؟"

"کملا" اشوک کہنے لگا جس میں سمجھانے کا انداز تھا: "تم جانتی ہو جس راستے پر میں چل رہا ہوں وہ کتنا خطرناک ہے۔ اور جس منزل کی میں تلاش میں ہوں وہ کتنی دور ہے۔ جس راہ پر میں گامزن ہوں وہ مصائب اور آلام کی آماجگاہ ہے۔ اگر تم میرے ساتھ ہو گی اور راستے میں تھک کر بیٹھنا چاہو گی تو دور دور تک کوئی سایہ دار درخت نہ ملے گا۔ تم میری ہم سفر بننا چاہتی ہو مگر یہ سمجھ لو کہ میرے ساتھ چلنے

چلتے تمہارے نازک پاؤں میں آبلے پڑ جائیں گے۔ تم راہ کی تکان کی وجہ سے پیاس سے بے تاب ہو جاؤ گی۔ ہونٹوں پر خشک پپڑیاں جم جائیں گی مگر پھر بھی پانی میسر نہ ہوگا۔ تم میرا خیال نہ کرو کملا۔ بلکہ اپنی طرف دیکھو۔ کیا تم نے اتنے مصائب برداشت کرنے کی ہمت ہے۔ مجھے خود احساس ہے کہ میں شاید تمہیں نہ بھول سکوں گا۔ مگر تم سے کہوں گا کہ جذبات سے مغلوب نہ ہو۔ مجھے بھول جاؤ ــــ جب یہ جذبات کے بادل چھٹ جائیں گے۔ طوفان تھم جائے گا۔ لہریں نہ اٹھیں گی اور پانی کی سطح ساکت ہوگی تو تم خود دیکھو گی کہ میں کتنا صحیح کہتا تھا ــــ"

"نہیں اشوک!" کملا نے جیسے بپھرتے ہوئے کہا "یہ نہیں ہو سکتا میں بھی تمہاری زندگی میں معاون بن کر رہوں گی۔ میں ہر مصیبت برداشت کر سکتی ہوں بشرطیکہ تم میرے ہو جاؤ ــــ لہریں شور مچاتی ہیں مگر پھر تھم جاتی ہیں۔ طوفان اٹھتا ہے مگر آخر کار رک جاتا ہے۔ مسافر دن بھر رہ نوردی کرتا ہے۔ طرح طرح کی مصیبتیں جھیلتا ہے۔ صرف اس امید پر کہ شام کو وہ اپنی منزل پر پہنچ جائے گا۔ اسی طرح ہمارا اور تمہارا تعلق ہے۔ ہمارے نظمِ حیات میں انتشار ہوگا لیکن ایک دن سمندر کی سطح کی طرح پرسکون ہو جائے گا۔ میں ایک بھٹکا ہوا مسافر ہوں اور تم ایک راہرو۔ جب میں تم کو پا جاؤں گی تو دونوں مل کر مستقبل کے لئے کوئی آہنگ مرتب کریں گے۔ منزل کی تلاش میں چلیں گے۔ بولو اشوک! کیا اب بھی مجھے اپنا ساتھی نہ بناؤ گے؟" اس نے آنسو پیتے ہوئے کہا۔

"کملا! تم جانتی ہو کہ میری منزل کس قدر غیر متعین ہے" اشوک نے کملا کو ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کی "میری زندگی کتنی دشوار گذار اور خطرناک

ہے میرے خیال میں۔ میرا ساتھی بننا خود کو موت کے سپرد کرنا ہے۔ جذبات کی شورش کو دباؤ۔ میں جانتا ہوں کہ میں تمھارے بغیر خوش نہیں رہ سکتا مگر تم میرے بغیر بھی خوش رہ سکتی ہو۔ حالات نے ہم دونوں کو مجبور کر رکھا ہے اپنا نہیں تو کم سے کم میرا ہی خیال کرو۔ کل دنیا مجھے کیا کہے گی۔ یہی نا کہ "بڑے لیڈر بنے پھرتے تھے۔ سیٹھ کی لڑکی پر ریجھے تو ساری لیڈری اور قومی خدمت خاک میں مل گئی۔ خدا ایسے لیڈر سے محفوظ رکھے" ——— تمھیں بناؤ کملا کہ کیا یہ الفاظ میں سن سکتا ہوں؟ میرا کہا مانو۔ دل سے میرا خیال نکال دو ———"

"نہیں اشوک!"، کملا نے ایسے انداز اور لہجہ میں کہا جس میں ارادہ اور استقلال کی جھلک تھی "میں نے دل میں طے کر لیا ہے کہ تمھارے ساتھ چلوں گی۔ اب میں زیادہ دنوں تک محبوس نہیں رہ سکتی۔ میرے صبر کا پیمانہ بھر چکا ہے ضبط کا چراغ گل ہوا چاہتا ہے۔ اگر تم مجھے اپنے ساتھ نہ لے چلو گے تو میں خود آجاؤں گی"

اشوک کچھ کہنا چاہتا تھا کہ سیٹھ جی آگئے۔ اور وہ کچھ نہ کہہ پایا۔ چائے پی گئی اور کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ انھیں باتوں کے دوران سیٹھ جی نے اشوک کے ذاتی حالات۔ تعلیم اور جائے قیام وغیرہ بھی پوچھ ڈالی

اشوک چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر اپنے گھر آیا تو اس کے دماغ پر افکار کا بار تھا۔ وہ ایک پرانی سی آرام کرسی پر لیٹ کر تمام واقعات پر غور کرنے لگا۔ کملا کی ملائم آواز اور تمام باتیں اس کے دل کے گوشوں میں گونج رہی تھیں۔ اور تھوڑی دیر کے لئے اشوک اپنے دل سے مجبور ہو کر سوچنے لگا:۔ واقعی کملا ہے تو حسین۔ اور میرا دل بھی اس کی طرف خود بخود کھنچ رہا ہے۔ اگر وہ میری زندگی میں داخل ہو جائے

تو یہ کٹھن منزلیں جن کی تلاش میں میں سرگرداں ہوں آسانی سے مل جائیں۔ مگر میں کر بھی کیا سکتا ہوں۔ امیر اور غریب کا ربط ہی کیا۔ سیٹھ جی اس رشتہ کو قطعی منظور نہ کریں گے۔ وہ اپنے خیالات کی بھول بھلیوں میں کھو گیا۔ اس پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ اس نے سگریٹ سلگایا تاکہ اس کے نیلگوں دھوئیں میں اپنے افکار کو اڑا دے۔ مگر وہ اتنا تھکا ہوا اور پریشان تھا کہ دو ہی منٹ بعد نیند نے اس کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ سگریٹ اس کی انگلیوں کے بیچ سلگتا رہا۔ اور جب جلتے جلتے اس کی آگ نے اس کی انگلیوں کو چھو لیا تو وہ جاگ اٹھا۔ اتنے میں دروازے کے پاس کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے اٹھکر دیکھنا چاہا۔ مگر دوسرے ہی لمحہ اس نے دیکھا کہ کملا ایک سیاہ چادر میں لپٹی لپٹائی دروازے پر کھڑی تھی۔

"تم!!" اشوک کے منہ سے حیرت میں نکلا۔ وہ کہنے لگا "تم یہاں کیسے آئیں؟"

"یہ بعد میں بتاؤنگی" کملا نے کہا "پہلے مجھے اندر آنے کی اجازت دیجئے" اشوک سوچ میں پڑ گیا۔ کہ وہ کملا کو بلائے یا نہ بلائے ——— رسوائی کا ڈر ——— سوسائٹی کا خیال ——— لیڈری کی آن ——— سماج کا خوف ——— اندھیری رات اور کملا شہر کے مشہور سیٹھ کی لڑکی ——— اسے جیل کی چہار دیواری نظر آنے لگی جس کی ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں وہ زنجیروں سے جکڑا پڑا ہے۔ وہ یہ سوچ کر لرز گیا۔ مگر پھر اس کے خیالات نے پلٹا کھایا۔ اس نے دروازہ پر کھڑی ہوئی معصوم اور حسین کملا کو دیکھا جو سرتاپا پیکر التجا معلوم ہوتی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ کملا اس کے وہاں آئی ہے۔ یہ انتہائی بداخلاقی اور کمینگی ہے کہ اس کو

اندر آنے کی اجازت نہ دی جائے اور بغیر کسی نتیجے پر پہنچے ہوئے اس نے کہہ دیا۔
"چلی آؤ!"

"مگر تم یہاں کیسے آئیں" اشوک نے فوراً سوال کیا "اور کیوں آئیں"

"ایک وقت میں دو سوال!" کملا نے قدرے مسکراتے ہوئے کہا۔ مگر خیر میں تمھارے دونوں سوالوں کا جواب دیتی ہوں ـــــ جب بابو جی تم سے تمھاری ذاتی زندگی کے متعلق بات چیت کر رہے تھے تو مجھے تمھارے مکان کا پتہ معلوم ہو گیا اور چونکہ میں نے کہا تھا کہ اگر تم مجھے اپنے ساتھ نہ لے چلو گے تو میں خود آ جاؤں گی اس لئے خود آ گئی ـــــ"

"مگر تم کو اتنی رات کو گھر سے نکلنے کی اجازت کس نے دی"۔ اشوک نے پوچھا۔

"اجازت!" وہ ہنستے ہوئے بولی "میں خود بغیر اطلاع کے چلی آئی"

"میں سمجھا!" اشوک نے کہا۔ اور سگریٹ سلگا کر اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ اس وقت وہ بلا کی حسین معلوم ہو رہی تھی۔ کالی چادر میں اس کا گورا مکھڑا اس طرح دمک رہا تھا جیسے بدلی میں چاند۔ اس کے گورے گورے ہاتھوں میں ایک ایک سیاہ چوڑی بہت زیب دے رہی تھی ـــــ اس کی آنکھوں اور چہرے سے کسی بڑی جرأت کے آثار نمایاں تھے۔ اشوک کو جھرجھری سی محسوس ہوئی۔ اس نے اپنے خیالات اور خاموشی کے سلسلے کو فوراً خود ہی توڑ دیا اور کہنے لگا "کملا تم تو خود سمجھ دار ہو۔ اگر تمھیں اپنا اور میرا خیال نہ تھا تو کم از کم سیٹھ جی کی عزت کا خیال کیا ہوتا۔ اگر کسی طرح میری اور تمھاری پوشیدہ ملاقات کا راز فاش ہو گیا تو سیٹھ جی

پر گھڑوں پانی پڑ جائے گا۔ ان کی سب عزت خاک میں مل جائے گی"

"تم بالکل اطمینان رکھو اشوک"، کملا نے مسہری کے ایک کونے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "مجھے کسی نے نہیں دیکھا ہے"

اشوک بدستور دماغی الجھنوں میں پھنسا ہوا تھا۔

"ہاں تو میں اس لئے آئی تھی کہ آپ سے اس بارے میں مزید گفتگو کروں" اس نے ذرا رک کر کہا "آپ پتا جی سے اس بارے میں گفتگو کیجئے۔ وہ ضرور آپ کی بات منظور کرلیں گے۔ ——"

اشوک کو بھی کچھ کچھ امکانی صورتیں نظر آنے لگیں۔ اور وہ اپنی لیڈری کو بھول کر کملا کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور کملا اس کے سامنے تھی۔ اس کے جذبات نے بھی انگڑائی لی اور اس نے سوچا، کاش سیٹھ جی یہ رشتہ منظور کرلیں،

"مگر تم جانتی ہو کملا"، اشوک بولا "اگر سیٹھ جی نے انکار کر دیا تو مجھے کتنا دکھ ہوگا۔ میں اس بری خبر کو برداشت نہ کر سکوں گا۔ اس لئے اس کام میں میرا ہاتھ ڈالنا اچھا نہیں ہے۔ تم ان کی اکلوتی لڑکی ہو۔ وہ تمہاری بات کبھی بھی رد نہ کرسکیں گے"

"مگر ہاں"، کملا تکئے کا سہارا لیتے ہوئے بولی "میں ان سے کیسے کہوں۔ یہ تو آپ کے کہنے کی بات ہے"

"ہاں ہے تو میرے ہی کہنے کی بات مگر میں ان سے کہہ نہ سکوں گا"، اشوک نے کہا "تم ہی کوئی دوسری صورت نکالو"

کملا کو جمائیاں سی آنے لگیں۔ اس نے اپنی چادر اتار کر ایک طرف کو رکھ دی اور آرام سے پلنگ پر بیٹھ گئی ——

"تم کو نیند آرہی ہے کملا" اشوک بولا "اب تم جاؤ۔ رات زیادہ ہوگئی ہے۔ اگر تمھاری تلاش ہوئی تو بڑی آفت ہوگی۔ اور دیکھو سیٹھ جی سے اس معاملے میں گفتگو کرنے کی کوشش کرنا"

"مجھے نیند ضرور آرہی ہے" کملا نے کہا "مگر اس اندھیاری رات میں گھر جانے کی ہمت نہیں پڑتی ہے۔ مجھے اندھیرے سے ڈر لگتا ہے"

"نہیں چلو میں تمھیں کچھ دور تک پہنچا دوں" اور وہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ اور کملا کو بھی اٹھنا پڑا۔ مگر جب دروازے تک وہ آئی تو اس کا ہاتھ بجلی کے بٹن پر پہنچ گیا —— ایک لمحہ کے بعد کمرے میں بالکل اندھیرا تھا —— اور اشوک مجبور تھا —— وہ بھی نوجوان تھا —— جذبات کے خلاف کب تک جاتا ——

جذبات کا طوفان تھم چکا تھا —— سطح خاموش اور موجیں ساکت۔ اور پھر کملا جانے لگی۔

"مگر تم تنہا کیسے جاؤ گی" اشوک نے دبی زبان سے کہا "تم کو ڈر لگے گا"

"نہیں میں چلی جاؤں گی" کملا نے کہا "ڈر کی تو کوئی بات نہیں ممکن ہے کہ تمھارے ساتھ چلنے سے کوئی خطرناک صورت پیدا ہو جائے، اور وہ جانے لگی —— اشوک دروازے پر نادم کھڑا تھا —— مگر محض ندامت کسی گناہ کا کفارہ نہیں ہو سکتی۔

"لیکن کملا سیٹھ صاحب سے اس بارے میں گفتگو کر لینا" اشوک نے چلنے

چلتے کہا۔

"ہاں سوچونگی" کملا نے کہا اور چلی گئی ــــــ اس کے آخری الفاظ اشوک کے کانوں میں تیر کی طرح چبھنے لگے ــــــ "سوچوں گی ــــــ سوچونگی" کملا کے آخری الفاظ کو وہ دہرانے لگا ــــــ اشوک معاملے کی تہ تک پہنچ چکا تھا۔ جذبات کی روشنی جو آئی اور چلی گئی ــــــ جوانی کی ہوا تھی جو چلی اور دفعتاً رک گئی ــــــ

"کتنا حسین دھوکا دیا کملا نے!" وہ سوچنے لگا۔

غزل

غرفہ

آج بھی وہ کمرے کے اسی غرفے میں بیٹھی تھی ____

گھر کے ہنگاموں، شور وغل اور چہل پہل سے جب اس کا جی گھبرا جاتا تو وہ اس غرفے میں آ کر بیٹھ جایا کرتی۔ یہاں بیٹھ کر اُسے تنہائی میں کچھ سوچنے کا موقع مل جایا کرتا اور وہ یہاں بیٹھ کر بڑا سکون محسوس کرتی۔ وہ یہاں اتنا خوش ہوتی، گویا اسے کوئی دولت مل گئی ہو۔ حقیقت میں تنہائی اور سکونِ قلب دولت ہی کا دوسرا نام ہے ____ کیا دولت کی تعریف انھیں چمکتے اور کھنکتے ہوئے سکوں تک محدود ہے ____؟ سکے جنھیں مزدوروں کی اجرت کاٹ کر اور غریبوں کے منہ کا نوالہ چھین کر حاصل کیا گیا ہو۔

یہ غرفہ اس کے اندرونی کمرے میں کھلتا تھا۔ ایسے ہی کئی اور غرفے تھے

مگر یہاں سے وہ نیچے بہتی ہوئی ندی کا سماں اور گھاٹ کا منظر پوری طرح دیکھ سکتی تھی
اس کے چھ منزلہ مکان سے گھاٹ پر نہاتے ہوئے مرد اور عورتیں ایسی معلوم ہوتیں
گویا بہت سی چڑیاں پانی میں ڈبکیاں لگا رہی ہوں۔ ندی اس کے مکان کے نچلے
حصے سے بالکل ملی ہوئی بہتی رہتی۔ اس کی شور مچاتی، اٹھتی اور بڑھتی ہوئی لہروں
کے دیکھنے میں اسے بڑا لطف آتا جب سورج کی کرنیں اٹھتی ہوئی لہروں پر پڑتیں تو
ایسا معلوم ہوتا کہ سیال چاندی کا ایک ریلا ہے جس کی چمک نگاہوں کو خیرہ کئے
دیتی ہے۔ ندی کے کنارے پر کہیں کہیں املتاس اور برگد کے گھنے درخت جھکے ہوئے
تھے۔ ساکت و صامت درخت، جیسے کسی گہری سوچ میں کھڑے ہوں سر جھکائے
ہوئے۔ کیا سوچتے ہوں گے یہ درخت؟ یہی کہ ہم کتنی بلندی پر ہیں، اور ندی کتنی
حقیر ہے جو ہمارے پاؤں چھوتی ہوئی گزر جاتی ہے۔ مگر نادان درختوں کو کیا معلوم
کہ ندی کی لہروں میں ایسے ہزاروں درختوں کو بہا لے جانے کی طاقت مخفی ہے۔

'دنیا میں بلندی اور پستی بھی کیا چیز ہیں' وہ سوچنے لگی۔ کور باطن کے
پاس اگر سرمایہ ہے تو وہ امیر ہے۔ باعزت اور سربلند ہے۔ اور غریب بہرحال غریب
ہے۔ اس کو دنیا میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔ اگر وہ رہنا چاہتا ہے تو ذلت سے
رہے ورنہ مرجائے۔ اگر وہ اپنی زندگی مالک اور آقا کی ٹھوکروں میں گزارنا چاہے
تو گزار دے۔ کوئی اسے نہیں روکتا۔ مگر بہرحال وہ رہے گا وہی غریب۔ کہلائے
گا وہی ذلیل وہی پست اور حقیر —— نادار اور مظلوم —— جس کی قیمت ایک
ڈانٹ، ایک گالی اور ایک ٹھوکر کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس نے گھبرا کر ندی کی

طرف سے منہ پھیر لیا۔ شاید اسے ان اونچے پیڑوں کے خیالات سے نفرت ہو گئی تھی۔ وہ اپنے کمرے کی چیزوں کا جائزہ لینے لگی۔ اعلیٰ قسم کے غالیچے، آبنوس کی خوبصورت مسہریاں، حسین میز اور اس پر بیش قیمت ریڈیو ——— سنگ مرمر کا بنا ہوا ایک نفیس مجسمہ، دلکش مرقعے، بیش بہا گھڑی ——— اس نے زیادہ نہ دیکھا گھبرا کر پھر ندی کی طرف منہ پھیر لیا۔ اسے یہ سامان کچھ بھی اچھا نہ لگتا تھا گھڑی کی ٹک ٹک جیسے اس کا منہ چڑھاتی ہو۔ دلکش تصاویر گویا اسی پر ہنستی ہوں اور ریڈیو جیسے اس کی بے بسی پر پھوں پھوں کر روتا ہو۔ اور غالیچے اس کا کفن ہوں جن میں وہ زندگی ہی میں لپیٹ دی گئی ہو۔ ان غالیچوں کو جیسے وہ چھوتے ہوئے ڈر رہی ہو کہ کہیں واقعی وہ مر نہ جائے۔ مسہری گویا ہر وقت روتی رہتی ہو۔ اپنے نصیب پر جس پر وہ کبھی بیٹھنا پسند نہ کرتی تھی۔ سنگ مرمر کا مجسمہ جیسے اس سے کہتا ہو کہ، دیکھ تجھ سے بہتر ہم ہیں جس کو سب پسند کرتے ہیں۔ پیار سے ہاتھ پھیرتے ہیں۔ اسے ایسا محسوس ہوا، جیسے اس پر بھی کوئی پیار سے ہاتھ پھیر رہا ہو۔ مگر یہ اس کا وہم تھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ بالکل تنہا تھی۔ تنہائی، بے چینی، اداسی اور اضطراب! ان سب کا جیتا جاگتا مجسمہ جیتا تھی جس پر کوئی ہاتھ پھیرنا پسند نہ کرتا ہو۔ وہ ہر وقت بیٹھی کچھ نہ کچھ سوچا کرتی تھی ——— کیا؟ ——— یہ اسے خود بھی نہ معلوم تھا۔ بس ہر لمحہ طرح طرح کے خیالات اس کے دماغ میں چکر لگاتے رہتے ——— جانے وہ اتنا سوچتی کیوں رہتی تھی؟۔

وہ شہر کے مشہور سیٹھ دامودر کی لڑکی تھی۔ سیٹھ صاحب کی تنہا اولاد۔ ہر طرح کی آزادی اور آرام۔ کوئی پابندی، کوئی روک ٹوک نہیں۔ جہاں چاہے جائے

چاہے جہاں اٹھے بیٹھے۔ مگر وہ سوچتی کہ آخر وہ کہیں جائے ہی کیوں؟ وہ پاگل تو نہیں کہ ادھر ادھر گھومتی پھرے۔ انسان سکونِ خاطر کے لئے کیا کچھ نہیں کرتا۔ بازاروں میں گھومتا ہے۔ سینما کو رونق بخشتا ہے۔ عالیشان دوکانوں کے آگے قیمتی اور حسین کار روک کر غریبوں پر رعب جماتا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ محض وقتی طور پر خوش ہونے کے لئے اور وہ اس طور پر کبھی خوش ہونا پسند نہ کرتی تھی۔ کہنے سننے سے وہ گھومنے چلی جاتی۔ مگر مناظر جیسے اُسے کھائے جاتے ہوں۔ لوگ جیسے اس کو گہری نظر سے دیکھتے ہوں۔ اتنی گہری نظریں جو اس کی بلاوز سے گزرتی ہوئی سینے میں اتر جائیں۔ کسی صورت اس کا دل بہلتا ہی نہ تھا۔ اسے اپنے گرد ایک خلا سا محسوس ہوتا تھا۔ ایک کی اور ایک ضرورت ایک مونس اور ایک دمساز کی، جو اسے تسلی دے سکے۔ اس کی غمگین فطرت کو خوشی میں ڈھال سکے مگر کون تھا ایسا جو اس کے لئے اتنی بڑی قربانی کرتا۔

وہ پڑھتی تھی ــــــ لڑکیوں کے مقامی کالج میں۔ جہاں کالج کھلتے ہی ایک ہنگامہ مچ جاتا۔ کالج کے لڑکے ادھر سے اپنے ہیٹ اور ٹائیاں درست کرتے ہوئے گزرتے، رکتے اور آنکھیں لڑاتے، اور جذباتی لڑکیاں انھیں دیکھتیں مسکراتیں اور اشارے کرتیں اور بس رومان ختم۔ اور کسی نے بہت کیا تو دو ایک ملاقاتیں کر لیں۔ سینما۔ پارک اور گنگا گھاٹ کی سیر کی اور پھر تسکینِ قلب ہو گئی۔ ایک ہمیشہ کے لئے برباد ہو گئی۔ اور وہ وفا وفا، رٹتی رہی اور دوسرے نے کوئی اور شکار پھانس لیا۔ ایک دو نہیں، اس قسم کے سینکڑوں ادھورے رومانوں

سے کالج کی فضا بھری پڑی ہے۔ سینکڑوں لڑکیوں نے دواؤں کا سہارا لیا۔ اور سینکڑوں بدنامی کے اندھے غار میں گر پڑیں۔ ہر طرف جنسی بھوک جنسی بھوک کی پکار، اسے یہاں کی گندی فضا سے نفرت ہو گئی تھی۔

وہ اپنی جوانی کی منزلیں تیزی سے طے کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شباب کا رنگ انگڑائیاں لے رہا تھا۔ اس کے رخساروں کی رنگت تیز گلابی ہو رہی تھی۔ اس کی چال میں ایک نمایاں تبدیلی ہو گئی تھی۔ وہ چلتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ اس نے ٹھنڈی سی شراب پی رکھی ہو جس کا اثر اس کی آنکھوں۔ اس کی چال اور اس کی باتوں میں رچ گیا ہو۔ اس کے نرم اور سیاہ بال بڑی شدومد سے بڑھ رہے تھے۔ گویا وہ بڑھتے بڑھتے اس کے پاؤں تک آجائیں گے اور وہ ان میں الجھ کر گر پڑے گی۔ گر پڑے گی کسی اندھے غار میں جہاں سے وہ نکلنا قطعی پسند نہ کرے گی اس کے ہونٹوں کی سرخی بالکل شام کی شفق سے ملتی جلتی تھی۔ گویا اس کے یاقوتی ہونٹ اسی شفق کا ایک تراشا ہوا خوبصورت ٹکڑا ہوں۔ اس کی ٹھوڑی کا گڑھا ایسا معلوم ہوتا کہ دن بدن گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ اور کوئی اس گڑھے میں گر پڑے گا۔ اور پھر کبھی نہ نکل سکے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ وہ کسی کو اس میں گرنے ہی کیوں دیتی۔ وہ سطحی جذبات کی قائل نہ تھی۔ وہ حقیقی محبت کی پیاسی تھی۔ جو ایک گوہر نایاب ہے۔ اس کے کانوں میں ہر طرف سے جنسی بھوک کی چیخیں سنائی دیتیں اور بہت ممکن ہے کہ لوگ اسی کے حسن بے پروائی کو دیکھ کر اسے بے حس کہتے ہوں۔ پتھر سمجھتے ہوں۔ لیکن کون جانے کہ وہ پتھر تھی یا موم۔ کوئی اس کے دل میں اتر کر دیکھتا کہ وہ اندر سے کتنی نرم اور رقیق ہے۔ مگر ایسا کوئی تھا ہی نہیں۔ یا یہ کہ اس کی نظر میں کوئی اس معیار پر پورا نہیں اترا

لوگ اسے دیکھتے اشارہ کرتے ۔ اپنے جال میں پھانسنے کی کوشش کرتے ۔ مگر وہ خوب سمجھتی تھی کہ یہ سب اس لئے ہے کہ وہ جوان ہے ۔ اور پھر ایک دولت مند کی لڑکی ہے ۔ اور اس نے دیکھا کہ جن لوگوں نے کچھ روز پہلے اس سے نظر بازی کی اظہار محبت کیا ، اور اس نے توجہ نہ کی ۔ وہ لوگ کچھ روز بعد دوسری جوان لڑکیوں کے ساتھ بھی حرکتیں کرتے ہوئے دکھائی دیئے ۔ آہ ، دوسری معصوم لڑکیاں ان کے جال میں آجاتی ہوں گی ! کون جانے ؟ —— کیا لڑکیاں صرف اسی لئے پیدا ہوتی ہیں کہ بی اے اور ایم اے کریں ۔ پڑھ لکھ کر کیمیا گر بن جائیں ۔ کیا ان کے پہلو میں دل نہیں ہوتا ؟ کیا وہ عورت نہیں ؟ کیا وہ نہیں چاہتیں کہ جب وہ تنہا ہوں تب کوئی ان کا ہمراز ہو ۔ دمساز ہو ؟ اور وہ اپنی زندگی کو تابندہ کریں ۔ گلزار بنائیں دنیا ہی میں جنت کا لطف اٹھائیں —— حقیقت میں دو دلوں کا مل جانا ہی جنت ہے ۔ اس سے زیادہ جنت میں ہوگا کیا ۔ حوریں ، غلماں ، دودھ کی نہریں ، شہد کی ندیاں اور ... اور ... اور ... اسے کچھ یاد نہ آیا ۔ وہ طنزیہ طور پر مسکرا دی ، مذہب کے خداؤں کے خیالات پر ——

کبھی کبھی وہ سوچا کرتی کہ کیا اس کے والدین کبھی جوان نہیں رہے ہوں گے ؟ کیا وہ ایک جوان لڑکی کے جذبات کو نہیں سمجھتے ہیں ؟ کیا ان کے پہلو میں دل نہیں ؟ پھر آخر یہ ظلم کیوں ؟ وہ اس کی افسردگی اور غمگینی سے اس کو بیمار تصور کر کے ڈاکٹروں کو فون کرتے ، اور ڈاکٹر فیس کے روپے لے کر اور اس کو چند کڑوی دوائیں پلا کر چل دیتا ۔ ہر طرف پیسہ کی مانگ ، دولت کی طلب ، کیا دنیا کی معراج میں چمکتے ہوئے سکے ہیں ۔

کالج کی فضا اس پر غیر شعوری طور پر اثر انداز ہوتی رہی، وہ اپنے نزدیک یہ سمجھتی تھی کہ وہ اس گندی فضا سے الگ رہتی ہے۔ لڑکوں کو منہ نہ لگاتی جذبات کی رو میں بہنا نہیں جانتی۔ لیکن حقیقت اس سے مختلف تھی ——— اپنے میں ایک کمی کا احساس۔ ایک خلا کو پر کرنے کا خیال۔ ایک مونس کی جستجو، جوانی کا تقاضہ .... کیا یہ سب کالج اثرات نہیں تھے۔

کار میں گھر آتے ہوئے وہ کالج کے قریب چوراہے پر طلبا کا اژدھام دیکھتی روزانہ یہ شمعوں کے پروانے گرلس کالج کی چھٹی سے پہلے یہاں آجاتے۔ اسے یہ ہجوم دیکھتے دیکھتے کئی برس گزر چکے تھے۔ ہر سال کچھ جانے پہچانے چہرے کم ہو جاتے اور ان کی جگہ نئے چہرے آجاتے۔ کوئی پان خریدتا ہوتا تو کوئی سگرٹ، کوئی خواہ مخواہ بار بار اپنی ٹائی درست کرتا، جیسے لڑکیاں اس کی ٹائی پر ریجھ ہی تو جائیں گی یہ لوگ کن انکھیوں سے، تانگوں، بگھیوں اور کاروں میں بیٹھی ہوئی لڑکیوں کو تاکتے جاتے، کسی لڑکی کے ہاتھ میں کوئی کتاب دیکھتے فوراً خود ہی چیخ اٹھتے کہ ہم بھی فلاں کتاب خریدیں گے۔ بڑی دلچسپ کتاب ہے، چاہے معلوم نہ ہو کہ کتاب فلسفہ کی ہے یا سائنس کی۔ مگر کہیں گے اس کو رنگین اور دلچسپ ہے کیونکہ وہ ایک لڑکی کے ہاتھ میں ہے بدتمیز کہیں کے۔ کتے!! اٹرک پران کتوں کا ہجوم دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں دکھ گئی تھیں۔ سب جنسی بھوک میں مبتلا تھے۔ سب یہی چاہتے تھے کہ کوئی لڑکی ان کو منہ لگائے اور وہ اس کی کیا دوشیزگی کو لوٹ لیں۔ چھند ——— ! اچکے!! ڈاکو!!!

وہ چاہتی تھی کہ اس راستے پر نہ آئے۔ مگر کوئی اور راستہ اسے معلوم ہی نہ

تھا۔ اس نے سوچا کہ اب وہ اس راستے کو قطعی طور پر بدل دے گی۔ اسے دبلے پتلے لڑکوں کے منظر سے نفرت ہو گئی تھی جن کا نصب العین ہی یہ تھا کہ دوسروں کو بٹو اور خود لطف اٹھاؤ۔ اس نے سوچا کہ اب کی کسی روز وہ اپنے شوفر کو لائے گی۔ تاکہ وہ اسے کوئی دوسرا راستہ بتا سکے ۔ تاکہ چوراہے کے اس گندے منظر سے نجات حاصل ہو جائے اور اس نے ایسا ہی کیا۔ چار بجے کالج سے چھٹی ہوئی یہ سہانا وقت تھا۔ عطر بیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ وہ کار میں بیٹھ گئی اور کار ہوا میں اڑنے لگی۔ جینا کو ایسا محسوس ہوا کہ کار کے ساتھ ساتھ وہ بھی اڑی جا رہی ہے۔ دور بہت دور۔ معلوم نہیں کہاں۔ اس نے کنارے کے ایک پارک میں حسین جوڑوں کو ہاتھ میں ہاتھ ڈالے گھومتے دیکھا۔ اس کے دل میں ایک خواہش بیدار ہوئی کہ وہ بھی اس وقت گنگا کے کنارے چہل قدمی کرے۔ اس نے شوفر سے اسی جانب کار موڑنے کو کہا۔

"کوٹھی پر نہیں چلوں؟"، شوفر نے پوچھا

"نہیں"، اس نے فیصلہ کن لہجہ میں جواب دیا۔

اور کار نے اپنا راستہ بدل دیا۔ اب وہ ایک سنسان سڑک پر چل رہی تھی۔ اکا دکا مسافر نظر آجاتے جس سے سڑک پر زندگی کی لہر دوڑ جاتی۔ ورنہ جینا، شوفر اور خود کار بالکل خاموش تھی۔ سڑک کے دونوں طرف گھنے درخت چھائے ہوئے تھے گویا ایک دوسرے کو پیار کر رہے ہوں۔ کتنا حسین خیال ہے؟ وہ سوچنے لگی۔ گھاس کے ایک کنج میں اس نے دیکھا کہ ایک گورا کسی عورت کو بری طرح چوم رہا

تھا۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں ایک خلش بھٹکنے لگی۔ وہ سوچنے لگی کہ "کاش ...

... ... ——"

"روک لو"، اس نے شوفر سے کہا۔ اور کار دھیمی ہونے لگی۔ اور پھر یک لخت رک گئی۔ اور جینا پیچھے سے اٹھ کر آگے کی سیٹ پر آ گئی۔ کار پھر اسٹارٹ ہو کر فراٹے بھرنے لگی۔ شوفر حیرت میں تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ پھر اس نے سوچا کہ ممکن ہے جینا کو پیچھے بیٹھنے میں کچھ تکلیف ہوئی ہو۔ فضا خنک تھی۔ ہلکا ہلکا نرنج ہو چلا تھا۔ ڈامر کی چمکتی ہوئی چکنی سڑک پر کار پھسلتی جا رہی تھی۔ سامنے سورج غروب ہو رہا تھا جس کی آخری شعاعیں نرم و سرخ ہو چکی تھیں، افق کے ماتھے پر شفق کا پسینہ آ چکا تھا۔ جینا کے دل میں ایک خلش، ایک میٹھی سی کسک بیدار ہو چکی تھی۔ فضا کا ذرہ ذرہ رومان کی تلقین کر رہا تھا۔ اور بہر حال جینا جوان تھی۔ اس کے سینے میں ایک آرزو انگڑائیاں لینے لگی۔ اور وہ شوفر کے کچھ اور قریب آ گئی۔ نشیب اور فراز پر کار ذرا سا اچھل جاتی اور اس بہانے سے جینا شوفر کے اور قریب آ جاتی۔ اور اس کے بدن کا رواں رواں رقص کرنے لگتا۔ جذبات کے دریا میں لہریں تیز اور تند ہو جاتیں۔ اس کی سانس تیز ہو جاتی اور اس کی گرم گرم آنچ شوفر کے دل میں بھی ایک کسک، ایک خلش پیدا کر دیتی۔

شوفر جوان تھا۔ وجیہہ صورت، بھرے بھرے بازو اور سڈول جسم۔ تھوڑا بہت پڑھا لکھا اور پھر غیر شادی شدہ تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ جینا کی کمر کے گرد اپنے بے تاب ہاتھ ڈال دے۔ مگر پھر اسے خیال آ جاتا کہ وہ شوفر ہے۔ غریب اور حقیر ہے کل کو جینا تو ایک دولت مند کی لڑکی ہونے کی وجہ سے بچ جائے گی۔ مگر اس کو نتائج

زندگی بھر جیل میں گزارنی پڑے گی۔ یا بھگوان جانے اس کا کیا ہو —— دونوں کے دل میں دو متضاد قسم کے خیال پیدا ہو رہے تھے۔ ایک جذبات سے مغلوب تھی اور دوسرے کو اپنی اور اپنے ساتھ بوڑھی ماں کی زندگی برباد ہو جانے کا اندیشہ تھا

اندھیرا ہو چکا تھا۔ اور شوفر کی سرد مہری سے جینا تنگ آ گئی تھی۔

"اندھیرا ہو چکا ہے"، شوفر نے جیسے ڈرتے ڈرتے کہا: "اب چلنا چاہئے"

جینا، شوفر کا مطلب سمجھ گئی: "ہوں"، وہ بولی اور دوبارہ پچھلی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی —— شوفر کی سرد مہری نے جذبات کے علاوہ بھی کچھ محسوس کرنے پر مجبور کیا۔ اپنی امارت، عزت، اور جوانی کی تضحیک ان سب کا خیال اس کے دل میں ایک ساتھ پیدا ہوا۔ پھر بھی وہ خوش نہیں تھی —— اس کی افسردگی اور بے کیفی کا سبب، شاید اس کی جوانی ٹھنڈی آگ ہی تھی۔ آخر کو آ گئی نا وہ جذبات کے بہاؤ میں بڑی stsnila ah اپنی تھی —— محبت کا کتنا بلند نظریہ قائم کیا تھا اس نے، اور کالج کی گندی فضا، طلبا کے رومان اور رسم و رواج سے اسے کتنی نفرت تھی —— لیکن کالج کی فضا نے، رومانی مناظر نے آخر اس پر اپنا اثر ڈال ہی دیا۔ اس کے آدرش کا سر جھکا دیا۔ اس نے شوفر کے سامنے جذبات کا اظہار کیا۔ اور تھوڑی دیر کے لئے اس کی دنیا کتنی رنگین اور کیف آور ہو گئی۔ مگر پھر یہ حدیں۔ یہ بندشیں۔ ننگ و ناموس کا لحاظ! آخر پھر بھی اس کے گرد ایک خلا قائم رہا۔ مناظر نے اس کے جذبات کی آگ کو تیز اور محبت کے معنی کو تنگ کر دیا تھا۔ وہ اب تنہا کالج جاتی تھی۔ اور اسی چوراہے سے بغیر کسی تنفر کے گزر جاتی۔ جہاں لڑکے لڑکیوں کے انتظار میں ان کو گھورنے کی غرض سے کھڑے رہتے۔ اس کی

بے چین نظریں بھی اپنے خلا میں کسی کو ڈھونڈتیں۔ مگر اسے کوئی نظر نہ آتا۔ ہر جانب جنسیت کے اظہار سے اس کو نفرت تھی۔ مگر اس کے باوجود وہ ان مناظر کو دیکھتی تھی اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا ... ...

اس کے خیالات کا سلسلہ کسی طرح ختم ہی نہیں ہوتا تھا۔ تیزی سے اس کے دماغ میں تمام گزشتہ واقعات چکر لگاتے گزر رہے تھے ——— اور وہ ان خیالات سے تنگ آ گئی تھی۔

"دنیا بھی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی"

"دنیا بھی ... " نیچے کوئی راہ گیر بلند آواز سے گاتا جا رہا تھا۔ وہ یوں ہی جھانک کر دیکھنے لگی۔ مگر اسے اندھیرے میں کچھ نظر نہ آیا ——— "واقعی "دنیا بھی دنیا ہے تو کیا یاد رہے گی"۔ جبینا زیر لب مصرع کو دہرانے لگی۔ وہ ندی کی طرف دیکھنے لگی۔ سورج بالکل غروب ہو چکا تھا۔ سڑکوں پر حسین بلب روشن ہو گئے تھے۔ اس کے کمرے میں اب تک اندھیرا تھا۔ وہ غرفے سے نکل آئی۔ اور کمرے میں بلب روشن کر دیا۔

اُتار چڑھاؤ

اُتار چڑھاؤ

اور اب تک راشد کو حیرت تھی کہ نجمہ چڑھاؤ کی طرف کیسے مائل ہو گئی ـــــــ

طوفان اتر چکا تھا مگر اثرات اب تک باقی تھے۔ راشد پلنگ پر لیٹا تو اس کا سانس تیز تیز چل رہا تھا۔ کئی سگریٹ پینے کے بعد بھی اس کے حواس مجتمع نہیں ہوئے۔ وہ سوچنے لگا کہ آخر یہ سب کیوں اور کیسے ہو گیا۔ ابھی شام کی ڈاک سے اس کو اپنی چچی کا خط ملا تھا کہ ان کی لڑکی نجمہ کا امتحان ختم ہو چکا ہے۔ اور وہ خود اس کو کانپور تک پہنچا جائے اور ایک لمحہ کے لئے راشد نے سوچا تھا کہ کانپور کا سفر کتنا حسین ہو گا۔ مگر دوسرے ہی لمحہ نجمہ اس کی نظروں میں پھر گئی تھی۔ سمٹی سمٹائی بے پروا قسم کی لڑکی۔ لڑکوں سے دس گز دور ہٹ کر چلنے والی۔ نہ زیادہ خوبصورت اور نہ بدصورت، البتہ شباب نے اس کو ایک نیا رنگ سا دیدیا تھا۔ مزاج چڑچڑا۔ بات بات پر ناک بھوں چڑھ جائیں

پڑھنے کے علاوہ دنیا کی کسی بات سے دلچسپی نہیں۔ بے پردگی کے سخت خلاف، جذبات اور رومان سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اور یہ سب سوچ کر اس کو نجمہ اور کانپور کے سفر سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ نجمہ رسم و رواج کی اسیر تھی اور بقول راشد اس کی زندگی اتار کی طرف جا رہی تھی۔ اور یہ اتار اس کو ایک ایسے غار میں پہنچا دے گا جہاں سے وہ پھر کبھی نہ نکل سکے گی۔ بس وہ ایک زندہ لاش کی طرح اپنی زندگی کے بقیہ دن اسی غار میں پورے کرتی رہے گی ——— اور آخر کار وہ سفر کی دلچسپیوں کی طرف سے قطعی مایوس ہو گیا اور پھر وہ خود ہی سوچنے لگا۔ کہ اس کو نجمہ کے متعلق یہ سب خیال کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اس کو نجمہ کو کانپور پہنچانے کا کام ایک فرض کی طرح ادا کرنا چاہیئے۔ تاکہ چچی جان کو شکایت کا موقع نہ ہو کہ راشد نے اس کے ساتھ ذرا بھی ہمدردی نہ کی ———

اور اس فرض کی ادائیگی کے خیال سے وہ اپنے دفتر سے جلد ہی اٹھ کھڑا ہوا تاکہ نجمہ کو شام کی گاڑی سے کانپور پہنچا کر وہ جلد ہی واپس لوٹ آئے۔ گرلس کالج پہنچکر اس نے نجمہ کو اطلاع کرائی۔ تانگہ منگوایا اور نجمہ نے اپنے آنے سے پہلے تانگہ میں باندھنے کے لئے پردہ بھجوا دیا جو اتنا مختصر تھا کہ پوری طرح بندھ بھی نہ سکا۔ پھر نجمہ آئی تو راشد حیرت میں رہ گیا۔ وہ بلاؤز اور ساری پہنے ہوئے تھی۔ راشد سوچنے لگا کہ نجمہ میں یہ تغیر کیسے ہوا یا تو کبھی سر پر سے دوپٹہ نہ الگ ہوتا تھا یا پھر دوپٹہ کا سرے سے وجود ہی نہیں ——— اسے تعجب تھا کہ جو لڑکی اب تک شلوار سے آگے نہ بڑھ سکی ہو وہ اکدم ساری اور بلاؤز میں کیسے آ گئی ——— مگر اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ نجمہ کے ہاتھ میں برقع اب تک موجود تھا۔ سلام و جواب کے مراحل طے ہونے کے بعد نجمہ تانگہ میں بیٹھ گئی مگر پردہ چھوٹا ہونے کی وجہ سے ہر طرف سے لوگ اس کو دیکھ سکتے تھے۔ راشد نے اپنے

دل میں سوچا کہ اس پردہ سے کیا حاصل؟ مگر وہ اعتراض نہ کر سکا۔ اس لئے کہ یہ اعتراض نجمہ سے ہٹ کر رسم و رواج پر بھی ضرب لگاتا تھا وہ چپ ہو رہا ——————

"ہر طرف تو سناٹا ہو رہا ہے" نجمہ نے کچھ ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا

"تو اس میں میرا کیا قصور —؟" راشد بولا "یہ تو آپ کی غلطی ہے کہ اس قدر مختصر سا پردہ بھجوایا۔"

"اس سے تو اچھا یہی ہے کہ پردہ نکلوا دیجئے" وہ چڑ کر بولی

"بہتر ہے" راشد نے کہا اور تانگہ والے سے کہہ کر پردہ ہٹوا دیا۔ مگر راشد اس فکر میں پڑ گیا کہ نجمہ کی جرأتیں اتنی بے باک کیسے ہو گئیں۔ نجمہ کے متعلق اس کا خیال تھا کہ اگر اس کا بس چلے تو وہ اپنے گھر میں بھی برقع اوڑھے رہے۔ مگر پھر یہ انقلاب کیسا ——؟ تھوڑی دور چلنے کے بعد راشد کو ایک اور بات سوجھی۔ اس نے کہا "جب آپ بے پردہ چل رہی ہیں تو پھر ہاتھ میں برقع کیوں ہے ——؟"

"احتیاط کے طور پر رکھ لیا تھا" اس نے جواب دیا

"اچھا —— آپ کی احتیاط ابھی باقی ہے" راشد نے کہا "جب بے پردہ ہو گئیں تو اب احتیاط کس بات کی ہے۔ یہ تو بہت برا معلوم ہوتا ہے کہ آپ برقع اور پردہ سب تانگہ ہی میں رکھے ہوئے ہیں۔ اس سے تو دیکھنے والوں کو آپ کے مجرم ہونے کا ثبوت مل رہا ہے"

"اچھا تو ان کو اٹیچی کیس میں رکھے دیتی ہوں" وہ بولی اور اسی وقت اٹیچی کھول کر دونوں چیزیں اسی میں رکھ دیں۔ راشد مسلسل یہی سوچ رہا تھا کہ نجمہ میں اتنا تغیر کیسے ہو گیا؟ تانگہ اسٹیشن کی طرف اڑا جا رہا تھا۔ بہت دیر تک دونوں میں کوئی بات چیت

نہیں ہوئی ——————

"میں رتن دیکھنا چاہتی ہوں" نجمہ بہت دیر بعد بولی "اگر آپ دکھا سکیں تو"

"مگر میٹنی شو تو شروع ہو چکا ہوگا" راشد نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "اور پہلا شو آپ اس لئے نہیں دیکھ سکتیں کہ ۸ بجے آپ کی ٹرین روانہ ہو جاتی ہے"

"اچھا تو پھر رہنے دیجئے" نجمہ نے جیسے مایوسی کے انداز میں کہا۔

"ہاں بظاہر تو کوئی صورت نظر نہیں آتی" راشد نے جواب دیا "دوسری بات یہ ہے کہ ٹرین کے آنے میں ابھی کامل تین گھنٹے کی دیر ہے۔ بہتر یہ ہے کہ آپ اتنے عرصہ میرے کوارٹر میں چل کر آرام فرمایئے۔ وہاں سے اسٹیشن بھی نزدیک پڑے گا"

"چلئے! جیسی آپ کی مرضی" نجمہ نے رضامندی کا اظہار کیا اور راشد نے تانگہ والے سے اپنے کوارٹر کی طرف چلنے کو کہا۔ تانگہ مڑ گیا۔

راشد دلّی کے دفتر میں ملازم تھا۔ مکانوں کی دقت کی وجہ سے وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ ایک مختصر سے کوارٹر میں رہتا تھا۔ کھانا دونوں دوست کسی ہوٹل میں کھاتے تھے اور شادی کی زنجیروں سے ابھی دونوں آزاد تھے۔ راستہ میں راشد نے سوچا کہ جب نجمہ رتن دیکھنے کی اس قدر مشتاق ہے تو کیوں نہ دیکھ لے اور پھر بجائے شام کے صبح کی گاڑی سے روانہ ہو جائے مگر اس کو امید نہ تھی کہ نجمہ اس بات کو پسند کرے گی کہ وہ راشد کے ساتھ اس کے مکان پر رات کو رہے اور صبح کی گاڑی سے روانہ ہو جائے ——

—— اور گھر پہنچ کر اسے ایک نئی مصیبت سے گذرنا پڑا۔ چونکہ راشد اس مکان میں نیا نیا آیا تھا اس لئے آس پاس کے لوگ اس سے کم واقف تھے۔ اور کچھ راشد کی

طبیعت بھی اس قسم کی تھی کہ وہ ہر شخص سے ملنا پسند نہ کرتا تھا۔ چونکہ راشد کا دوست شکیل ابھی اپنے دفتر سے واپس نہ لوٹا تھا اس لئے وہ نجمہ کو لے کر سیدھا اوپر پہنچ گیا۔ اور جب وہ تانگہ والے کو پیسے دینے کے لئے نیچے اترا تو اس نے لوگوں کے درمیان طرح طرح کی چہ میگوئیاں سنیں۔ سب کی گفتگو کا موضوع نجمہ اور راشد تھے۔ کوئی کچھ کہہ رہا تھا اور کوئی کچھ۔ راشد کو ان کی باتیں سن کر بڑا غصہ آیا۔ اس کا جی چاہا کہ ان سے لڑ پڑے۔ ان کا گلا دبا کر ان سے پوچھے کہ وہ ہر لڑکی کو کسی مرد کے ساتھ دیکھ کر اس کی بیوی یا محبوبہ ہی کیوں تصور کرتے ہیں۔ کیا وہ اس کی بہن نہیں ہو سکتی۔ لیکن وہ کچھ بھی نہ کہہ پایا اور کہہ بھی کیا سکتا تھا ——؟

راشد اوپر پہنچا تو نجمہ بیٹھی ہوئی تھی۔ راشد بھی بیٹھ گیا۔ بڑی دیر تک دونوں میں سے کوئی نہ بولا۔ یہاں تک کہ راشد کو کوفت سی محسوس ہونے لگی۔ اور آخر کار اس نے نجمہ کی مجبور زندگی پر طنز کرتے ہوئے کہا کہ اس کی محبوبہ سلمیٰ کا خط آیا ہے جس میں نجمہ کے بارے میں بھی دو ایک جملے لکھے تھے۔

"کیا لکھا تھا ——؟" نجمہ جیسے اک دم چونک پڑی۔ وہ یہ معلوم کرنے کے لئے بے چین ہو گئی کہ سلمیٰ نے اس کے بارے میں کیا لکھا ہے حالانکہ وہ براہ راست نہ سلمیٰ سے واقف تھی اور نہ سلمیٰ اس سے۔ نجمہ کو صرف اتنا معلوم تھا کہ راشد سے اور لکھنؤ کی ایک لڑکی سلمیٰ سے ملاقات ہے اور خط و کتابت بھی ہے۔ مگر اس سے زیادہ وہ کچھ نہ جانتی تھی۔

"کیا لکھا تھا اس خط میں ——؟" نجمہ نے راشد کو خاموش دیکھ کر دوبارہ پوچھا۔
"یہ تو مجھ کو یاد نہیں کہ خط کے الفاظ کیا تھے" راشد نے جواب دیا۔ "لیکن اگر

تم معلوم کرنے کے لئے بے چین ہی ہو تو گھر جا کر میری چھوٹی بہن سے خط لے کر پڑھ لینا"

اور پھر بات ختم ہو گئی۔ پھر وہی سکوت۔ وہی خاموشی ——— نجمہ ابھی تک متفکر سی نظر آ رہی تھی۔ شاید وہ سوچتی ہو گی کہ سلمیٰ اس کو کس طرح جانتی ہے اور اس نے راشد کو اس کے بارے میں کیا لکھا ہو گا۔

"تم نے سلمیٰ کے افسانے بھی پڑھے ——— ؟" راشد نے نجمہ کی رجعت پسندی پر ایک اور طنز کیا۔

"جی ہاں پڑھے" نجمہ جیسے بے دلی سے بولی "بہت عمدہ لکھتی ہیں"

"آپ کو ان چیزوں کا شوق نہیں" راشد نے پوچھا

"ہاں تھا تو کبھی" وہ بولی "ابتدا میں دو ایک افسانے لکھے مگر وہ کہیں ضائع ہو گئے اور پھر میں نے کبھی کچھ نہ لکھا"

"سلمیٰ کو تو گانے اور رقص میں بھی بڑا ملکہ حاصل ہے" راشد نے ایک اور وار کیا۔

"بہت خوب ——— !" نجمہ نے کہا مگر راشد کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ سب باتیں اوپری دل سے کہہ رہی ہو۔ اسے سلمیٰ کے ذکر سے الجھن سی ہو رہی تھی نجمہ اپنے اصلی جذبات کو چھپا رہی تھی ——— اور پھر وہی خاموشی۔ وہی دونوں کا اجنبی احساس ——— مستقل سکوت۔ جیسے دنیا کے تمام موضوعات ختم ہو چکے ہوں ———

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ صبح کی ٹرین سے کانپور جائیں ——— ؟" راشد نے خاموشی کو توڑا۔

"ہونے کو کیا نہیں ہو سکتا،، نجمہ بولی " لیکن ایسا کیوں کیا جائے ؟،،
"اس لئے کہ اس صورت میں آپ رتن دیکھ سکتی ہیں۔ جس کی آپ کو خواہش ہے"
راشد نے کہا۔ اور اسے حیرت ہو گئی کہ نجمہ نے اس صورت کو پسند کر لیا۔
"تو پھر تیار ہو جائیے،، راشد نے کہا " ورنہ پہلا شو بھی نہ مل سکے گا،،۔
اور نجمہ کپڑے تبدیل کرنے لگی۔ راشد کا دوست شکیل اب تک دفتر سے واپس نہیں آیا تھا۔ لہٰذا یہ دونوں بغیر اس کا انتظار کئے سینما چلے گئے ـــــــ

راشد اس کھیل کو کئی بار دیکھ چکا تھا۔ اُسے کوئی خاص لطف نہ آیا۔ مگر نجمہ کی نظریں برابر پردۂ فلم پر جمی رہیں ـــــــ راشد کو مستقل کوفت ہو رہی تھی۔ دونوں خاموش بیٹھے تھے ـــــــ کوئی بات چیت نہیں۔ نجمہ کی کرسی اس کی کرسی سے بالکل ملی ہوئی تھی مگر اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ دونوں ایک دوسرے سے کوسوں دور ہوں۔ زیادہ سے زیادہ کسی کی ایکٹنگ پر ہنس دیے یا اظہار ہمدردی کر دیا اور بس۔ راشد خود کو ملامت کر رہا تھا کہ وہ نجمہ کے ساتھ سینما دیکھنے آیا جب وہ اس کی فطرت سے خوب واقف تھا۔ مگر اب تو غلطی کر ہی بیٹھا تھا۔ خاموشی سے کھیل دیکھتا رہا یہاں تک کہ تصویر ختم ہو گئی۔ پلٹے تو اتفاق سے دور تک کوئی تانگہ نہ ملا۔ مجبوراً رکشا کر لی۔ رکشا میں گنجائش ہی کتنی ہوتی ہے۔ راشد اور نجمہ رکشا میں بیٹھے تو دونوں کے جسم ایک دوسرے سے بالکل چھونے لگے۔ مگر جسموں میں کوئی لرزش نہ ہوئی۔ کوئی حرکت عمل میں نہ آئی۔ گویا کہ آگ اور پانی کا تصادم ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ شکست آگ کی تھی۔ راشد کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی پتھر کے تراشے ہوئے بت سے ملا بیٹھا ہو۔ راستے بھر مستقل خاموشی رہی۔ کبھی کبھی ایک آدھ بات ہو گئی مگر راشد نے اس کی بےکار باتوں میں دلچسپی نہ لی ـــــــ مکان

کے قریب دونوں رکشا سے اترے۔ ایک ہوٹل میں کھانا کھایا۔ اور پھر گھر آگئے۔

شکیل جب دفتر سے آیا تو گھر کی بدلی ہوئی فضا کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ایک نیا اٹیچی کیس، کھونٹی پر ٹنگی ہوئی ساری اور بلاؤز، اور کرسیوں کی بے ترتیبی اس کی حیرت میں اضافہ کر رہی تھیں۔

شکیل کی زندگی بالکل ایک مشین کے پرزے کی طرح تھی جو ہمیشہ اپنے ایک مخصوص انداز میں گھومتا رہتا ہے۔ کوئی تغیر کوئی تبدل نہیں۔ وہ دفتر سے آتا تو تھکا ہارا چارپائی پر پڑا رہتا۔ تھوڑی دیر راشد سے باتیں کرتا اور پھر سو رہتا ——— صبح ہوتے ہی پھر وہی دفتر۔ وہی مشین کا پرزہ اور وہی پیٹ کا سوال ——— بھولے بھٹکے کسی روز گھومنے چلا جاتا ورنہ اس کی طبیعت اس طرف بھی نہ آتی تھی۔

اور آج جب راشد گھر پر موجود نہ تھا وہ ذرا گھومنے کے لئے بازار کی طرف چلا گیا تھا۔ مگر وہاں اس کا دل نہ لگا۔ وہ نو بجے سے پہلے پہلے گھر لوٹ آیا۔ صبح کے اخبار کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا اور اتنے میں راشد اور نجمہ آپہنچے۔ شکیل ان کو دیکھ کر حیرت میں آگیا۔ راشد نے تعارف کرایا تو شکیل کو پتہ چلا کہ نجمہ راشد کی چچازاد بہن ہے ورنہ وہ جانے کیا سمجھ بیٹھا تھا ——— مگر راشد کو حیرت تھی کہ آج نجمہ بغیر کسی جھجک کے اس کے دوست شکیل کے سامنے کس طرح آگئی ——— کہاں وہ برقع اور کہاں یہ بے حجابی۔ مگر وہ سوچتا ہی رہ گیا۔ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا۔

سب اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹ گئے۔ صحن میں راشد کا پلنگ تھا اور اس کے دائیں ہاتھ پر نجمہ کے لئے مسہری بچھا دی گئی۔ جو خاص خاص موقعوں پر کمرے سے نکلا کرتی تھی۔ اور شکیل نے اپنا پلنگ ہوا کی لالچ میں کھڑکی کے قریب بچھا رکھا تھا

اس لئے وہ راشد کے پلنگ سے کافی دور تھا ـــــــ تھوڑی دیر تک شکیل اور راشد باتیں کرتے رہے یہاں تک کہ شکیل سو گیا۔ اس کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز آنے لگی

ـــــــــــــــ

شام کو ترشح ہو جانے کی وجہ سے دھلا ہوا چاند بہت پیارا نظر آ رہا تھا۔ فضا میں جیسے مستی حل ہو گئی تھی ـــــــ ستاروں کی آنکھیں نیند سے بوجھل معلوم ہو رہی تھیں۔ ہر شے پر جیسے حسن اور رومانیت کا غلبہ ہو۔ راشد کو نیند نہ آ رہی تھی۔ وہ برابر سگریٹ پر سگریٹ پئے جا رہا تھا۔ اور اس نے محسوس کیا کہ قریب لیٹی ہوئی نجمہ بھی اب تک جاگ رہی تھی۔ راشد نے سوچا کہ نجمہ سے کچھ بات کرے مگر وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ دونوں اپنے اپنے پلنگ پر کروٹ بدلتے رہے۔ یہاں تک کہ گھڑی نے بارہ بجا دیئے۔ دونوں اب تک جاگ رہے تھے ـــــــ !!

"تم سوئیں کیوں نہیں؟" راشد نے آہستہ سے سرگوشی کے انداز میں پوچھا

"نیند نہیں آتی ہے" وہ بولی ـــــــ "آپ کیوں نہیں سوتے۔؟"

"مجھے بھی اب تک نیند نہیں آ رہی ہے" راشد نے جواب دیا ـــــــ "

"اچھا اب ہم دونوں سو جائیں ـــــــ" اور دونوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے واقعی وہ سونے کی کوشش کر رہے ہوں۔ دونوں کی چارپائی جانے کیوں بالکل قریب تھیں راشد کو نجمہ کی گرم سانسوں کی ہلکی سی لو اپنے قریب محسوس ہو رہی تھی ـــــــ اور غنودگی کے عالم میں جانے کس طرح نجمہ کا ملائم اور گرم ہاتھ راشد کے ہاتھ سے چھو گیا۔ راشد نے اس کیف انگیز لمس کو محسوس کیا۔ اس کی رگ رگ میں ایک برقی لہر دوڑ گئی۔ اور تھوڑی دیر بعد ـــــــ تھوڑی دیر بعد نجمہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔

"آہ!" نجمہ نے زیر لب کہا اور خود ہی اپنے ہاتھوں سے اپنا سر دبانے لگی۔
"کیا ہو گیا تم کو ——؟" راشد نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا
"کچھ بھی نہیں" وہ بولی "ذرا سر میں ——"
"درد ——؟" اس نے پوچھا
"جی" وہ آہستہ سے بولی اور اپنا سر پھر دبانے لگی۔
"لاؤ میں سر دبا دوں ——!" راشد نے جرات کر کے کہا
"نہیں" وہ بولی "آپ تکلیف نہ کیجیے"
"اس میں تکلیف کی کیا بات ہے" راشد نے کہا اور نجمہ کے سرہانے بیٹھ کر اس کا سر دبانے لگا۔ اور پھر راشد کے ہاتھ کی رفتار دھیمی پڑ گئی۔ اس کی انگلیاں نجمہ کے ملائم بالوں کے ریشمی تاروں سے الجھنے لگیں۔

"اور اگر کوئی دیکھ لے" نجمہ نے دوراندیشی کے طور پر کہا "کہ آپ میرا سر دبا رہے ہیں"

"یہاں دیکھنے والا ہی کون ہے" راشد نے نجمہ کے اندیشے کو دور کرتے ہوئے کہا "اور اگر شکیل جاگ بھی جائے تو اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ تمھارا سر ہی تو دبا رہا ہوں"

اور پھر جیسے نجمہ کو اطمینان سا ہو گیا۔ اس نے آہستہ سے راشد کے دونوں ہاتھوں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اور ان پر اپنے ملائم ہاتھ پھیرنے لگی۔ راشد بھی بے اختیار سا ہو چلا۔ سانسوں کے مست بگولوں کی رفتار تیز ہو گئی۔ اور پھر یکایک نجمہ نے راشد کے ہاتھوں کو اپنے سینے پر رکھ لیا۔ راشد کے ہاتھوں نے نجمہ کے دھڑکتے دل کی مد

کو محسوس کیا۔ راشد کی حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اسے نجمہ کی طرف سے ایسے اقدام کی امید نہ تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ نجمہ اتنی آزاد خیال کب سے ہو گئی ــــــ یا تو وہ اُتار کی طرف مائل تھی۔ غاروں کے منہ اس کو نگلنے کے لئے کھلے تھے۔ یا آج وہ چڑھاؤ کی طرف جا رہی تھی۔ بلندیوں کی طرف بڑھ رہی تھی ــــــ آج وہ زندگی کے دوش بدوش تھی۔ زندگی کا راز پا گئی تھی۔ راشد نے چڑھاؤ تک پہنچنے میں نجمہ کا ساتھ دیا ــــــ اس نے نجمہ کے جلتے ہوئے ہونٹوں پر دوستی اور پیار کی مہر ثبت کر دی ــــــ سینے کی تیز تیز دھڑکنوں، مہکتی گرم گرم سانسوں اور ہونٹوں پر مبہم کانپتے ہوئے فقروں کی حسین جنت میں دونوں کھو گئے ــــــ

"آپ بہت شریر ہیں،" نجمہ نے چند لمحوں بعد کہا ــــــ اور اس کا سینہ اور تیزی سے دھڑکنے لگا۔ "مگر مجھے ڈر ہے کہ ــــــ آپ نے جو مجھ کو ــــــ سہارا دیا ہے ــــــ وہ کہیں ٹوٹ نہ جائے،" سانسوں کے تموج میں اس نے رک رک کر فقرہ پورا کیا۔

"نہیں ایسا نہ ہو گا،" راشد نے کہا "البتہ آج سے پہلے اس کا امکان نہ تھا"

"وہ کیوں ــــــ؟" نجمہ نے پوچھا

"اس لئے کہ اب تک تم ایک اُتار کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ اور مجھے تم سے کوئی بھی ہمدردی نہ تھی لیکن اب ــــــ" راشد نے ذرا رک کر کہا ــــــ "اب تم چڑھاؤ کی طرف جا رہی ہو ــــــ اور میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

"اوہ!" نجمہ نے کہا "میں سمجھ گئی ــــــ"

دور گھڑی نے چار بجا دیئے۔

راشد پلنگ پر لیٹا تو اس کا بدن چور چور سا تھا۔ جیسے اس نے تھوڑی سی پی ہو۔ وہ سوچ رہا تھا کہ نجمہ میں اتنا زبردست تغیر کیسے ہو گیا۔ مگر وہ کچھ بھی نہ سوچ سکا اور نجانے کب نیند کی پری اس کو اپنے ساتھ اڑا لے گئی۔

ردِّعمل

رِدِّ عمل

اور پھر یکایک عذرا کے خطوط آنا بند ہو گئے۔ یا تو ہر چھٹے روز اُس کے ہاتھوں میں یا عذرا کے نازک ہاتھوں کا لکھا ہوا حسین خط ہوتا تھا۔ یا پھر پرویز کو آج پندرہ روز سے عذرا کی کوئی خیریت نہ ملی تھی۔ پرویز سوچنے لگا کہ آخر ایسا کیوں ہوا؟ مگر وہ کچھ بھی تو نہ سوچ سکا اس کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ عذرا کے اس ترکِ تعلق کا کیا سبب ہو سکتا ہے۔

پرویز نے دنیا کو کھو کر عذرا کو پایا تھا۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس کو اتنی آسانی سے کھو دیتا۔ اُس نے متواتر خطوط لکھے مگر سب کا جواب ندارد۔ اس نے سوچا کہ وہ خود جا کر عذرا سے ملاقات کرے۔ مگر پرویز کے لئے یہ کسی صورت سے ممکن نہ تھا، اس کے والدین کو اس کی روانگی سے ضرور شبہ ہو جاتا۔ اور وہ محبت کے اِس راز کو اُس وقت تک راز رکھنا چاہتا تھا جب تک وہ خود اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو جائے۔ اس کی سمجھ میں اس

کے علاوہ کچھ نہ آیا کہ وہ عذرا کو خط پر خط لکھتا رہے۔ آخر کبھی تو وہ جواب دے گی۔ اور اس پندرہ دن کے عرصے میں اس نے تقریباً چھ خط لکھ ڈالے۔ مگر آخر کب تک ـــــــ ہ؟ اسے کچھ ہوش آیا۔ کچھ اپنی دیوانگی پر ہنسی آئی اور اس نے خط لکھنے سے قطعی ہاتھ روک لیا۔ مگر وہ عذرا کی یاد کو کیا کرتا جو ہر وقت اس کو ستاتی رہتی تھی۔ وہ اپنی طبیعت کی بے کیفی کو کہاں لے جاتا۔ عرصے تک وہ یہی سوچتا رہا کہ کیا کرے۔ پھر اچانک اس کی سمجھ میں ایک ترکیب آ گئی۔ اس نے عذرا کے تمام خطوط پڑھنا شروع کئے تاکہ ماضی کے حسین دھندلکوں میں خود کو کھو دے۔ اُف کتنے محبت بھرے خطوط تھے۔ ہر ہر لفظ خلوص اور پیار میں ڈوبا ہوا۔ کہیں ملاقاتوں کے وعدے، کہیں محبت کا دلچسپ فلسفہ، شادی کے مسئلہ پر بحث، اپنے ماحول کی تلخی کا ذکر، شب کی اختر شماریاں ....ـــــــ اور اس نے ایسا محسوس کیا جیسے اس کی زندگی کا شاداب حصہ ایک حسین مگر ادھورے خواب میں بسر ہو گیا۔ پرویز جب ان خطوط کو پڑھتا تو عذرا کی تصویر بھی اپنے سامنے میز پر رکھ لیتا۔ اس کے خطوط کے دلچسپ اور غیر فانی جملے رک رک کر پڑھتا اور لذت حاصل کرتا۔ اور ساتھ ہی ساتھ عذرا کی تصویر کی طرف دیکھ دیکھ کر باتیں بھی کرتا جاتا۔ جب بھی پرویز کو عذرا کی طویل خاموشی کا احساس ہوتا وہ اس کی تصویر سے باتیں کر کے اپنا دل بہلا لیتا۔

"کیوں عذرا تمہیں اپنے وہ عہد و پیمان تو یاد ہوں گے جو تم نے مجھ سے آخری ملاقات میں کئے تھے۔ وہ تصویر سے سوال کرتا ـــــــ اور تصویر کے لبوں کو جیسے ہلکی سی پراسرار جنبش ہوتی! ہاں یاد تو ہیں، کیا واقعی تم کو بھی مجھ سے اتنی ہی محبت ہے۔ جتنی کہ مجھ کو ـــــــ وہ دوبارہ سوال کرتا اور تصویر جیسے پھر بول اٹھتی، ہاں پرویز

اور پرویز یہ جواب پاکر تصویر کو سینے سے لگا لیتا۔ دیر تک اسے سینے سے لگائے رہتا پیار کرتا لیکن پھر یکایک کچھ سوچ کر وہ تصویر کو سینے سے ہٹا کر میز پر رکھ دیتا۔

"اچھا عذرا یہ تو بتاؤ کہ تم نے خط لکھنے کیوں بند کر دیئے ـــــــ؟ وہ پوچھنے لگتا۔ اور تصویر کی طرف خوب غور سے دیکھتا رہتا۔ محض یہ دیکھنے کے لئے کہ عذرا اس سوال کا کیا جواب دیتی ہے۔ مگر اس بار عذرا کے لب جنبش نہ کرتے اور پرویز بے قرار ہو جاتا کہ عذرا اس سوال کا جواب کیوں نہیں دیتی؟ ـــــــ اور دیر تک اس پر یہی جنونی کیفیت طاری رہتی کہ وہ عذرا کی تصویر کو سامنے رکھے جواب کا منتظر بیٹھا رہتا مگر تصویر کے نازک اور جامد لبوں سے کوئی جواب بن نہ پڑتا ـــــــ وہ روزانہ ان خطوط کو پڑھتا رہتا جن کی تعداد سو کے قریب تھی۔ اور جو عذرا اس کو وقتاً فوقتاً لکھتی رہی تھی۔ کچھ چھوٹے چھوٹے پرچے، کچھ رنگین پیڈ کے کاغذ اور کچھ پورے سائز کے کئی کئی صفحات۔ لیکن آخر کار وہ ان خطوط کے پڑھنے سے بھی اکتا گیا تھا۔ اب وہ عذرا کی طرف سے نئے خطوط چاہتا تھا۔ حسین اور محبت بھرے خطوط ـــــــ اور پھر وہ انتظار کرنے لگا کہ عذرا کا کوئی خط آئے ـــــــ کئی ہفتے اس انتظار میں گزر گئے ـــــــ اور پھر عذرا کی سہیلی رخسانہ کی ایک چھوٹی سی تحریر موصول ہوئی کہ "عذرا کی شادی ہو رہی ہے۔ وہ آپ سے گزارش کرتی ہے کہ اس کے تمام خطوط اور تصویر واپس کر دیں"۔ ـــــــ پرویز کے سر پر جیسے پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ عذرا نے کہا تھا کہ وہ پرویز کے علاوہ کسی کو اپنا جیون ساتھی نہ بنائے گی۔ اور پرویز اب تک تصور کے بے شمار حسین محل بنا چکا تھا۔ جن میں اس کے اور عذرا کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ لیکن رخسانہ کی اس ایک تحریر نے اس کے تصور کے سب محل چکنا چور کر دیئے۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ عذرا اپنے

وعدے سے کیوں پھر گئی ـــــ؟ اُس نے تو یہاں تک کہا تھا کہ اگر پرویز سے شادی کرنے میں اُس کے اوپر کچھ سختی کی گئی تو وہ اپنا گھر بھی چھوڑ دے گی ـــــ اور پرویز کو یقین تھا کہ عذرا ایسا ضرور کرے گی ـــــ کیونکہ اس سے پہلے بھی وہ پرویز سے اپنے گھر والوں کی مرضی کے خلاف ہونے ہوئے بھی ملا کرتی تھی۔ اور یہ ملاقاتیں اتنی رنگین اور کیف پرور ہوتی تھیں کہ پرویز کو یقین ہونے لگا تھا کہ اس سے زیادہ خوش قسمت دنیا میں کوئی نہیں ہے۔

لیکن اب ـــــ! اب عذرا دوسرے کی ہونے والی تھی ـــــ اور پرویز کی زندگی کا ستارہ جیسے تاریکیوں میں ڈوبنے والا ہو۔ اسے جس قدر اپنی محبت کی پایندگی کی خوشی تھی اتنا ہی اس کی شکستگی کا صدمہ ہوا، اور مارے غم کے اس کی حالت عجیب سی ہوگئی جیسے وہ بالکل دیوانہ ہوگیا ہو ـــــ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب وہ کیا کرے، جیئے یا مرے، جب زندگی موت سے بدتر ہوگئی ہو تو گڑ گڑا کر جینے سے کیا فائدہ؟ کیوں نہ کچھ کھا کر سو رہے یا خود کو دریا کی طوفانی موجوں کے سپرد کردے، مگر وہ کوئی فیصلہ نہ کرسکا۔

غم کا عنصر اس کی فطرت میں اس قدر داخل ہوگیا تھا کہ وہ ہر وقت روتا ہوا نظر آتا تھا، پرویز کے دوست پریشان تھے کہ آخر اس کو کیا ہوگیا ہے۔ لیکن اس نے کسی پر اپنا راز ظاہر ہی نہ کیا۔ روز بروز اس کا غم بڑھتا ہی جاتا تھا۔ جیسے یہ غم اس کی جان ہی لے کر ٹلے گا۔ اور اسے اسی غم کی بدولت عذرا کی بے وفائی کی صعوبتوں سے نجات مل جائے گی۔

لیکن وہ ابھی جینا چاہتا تھا۔ پرویز نے ابھی زندگی کی بائیس ہی بہاریں تو دیکھی

تھیں وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس حسین دنیا کو اتنی جلد چھوڑ دے۔ وہ ابھی دنیا میں رہ کر دنیا کے نشیب و فراز سے گزرنا چاہتا تھا۔ اور اسی آرزو نے اس کی فطرت میں انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ ہو سکتا ہے کہ عذرا اس سے محبت نہ کرتی ہو۔ وہ پرویز کو ایک کھلونا سمجھ کر کھیلنا چاہتی ہو ____ ممکن ہے عذرا اس کو صرف اس لئے چاہتی ہو کہ اس کو کوئی دوسرا نہ ملا۔ اور عذرا کا پہلا جوہری پرویز ہی ہو۔ عذرا جوان اور غیر شادی شدہ تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنے جذبات کی رو میں بہہ کر پرویز کا سہارا لیا ہو۔ اور جب اس کو کوئی دوسرا رفیقِ زندگی ملا ہو جو پرویز سے زیادہ خوش حال ہو۔ تو عذرا نے اُسے ٹھکرا دیا ____ اور اسی قسم کے خیالات اس کے دماغ میں چکر لگانے لگے۔ اس نے سوچا کہ جب عذرا نے اس کی پروانہ کی تو اُسے کیا ضرورت ہے کہ خواہ مخواہ اس کی یاد میں اپنی زندگی کو تلخ بنائے۔ کیوں نہ وہ بھی عذرا کو فراموش کرنے کی کوشش کرے۔

ایک روز جب وہ بہت اداس اور پریشان تھا تو تنہائی، اداسی، مایوسی اور تلخیوں سے گھبرا کر وہ ایک "کوٹھے" پر چڑھ گیا ____ اس کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ "حسن" کے بازار میں خریداری کر رہا تھا۔ زینہ پر پہنچتے ہی اس کے پاؤں ڈگمگانے لگے۔ اُس نے سوچا وہ واپس چلا جائے مگر نہ جانے کون سی طاقت اس کو اوپر ڈھکیل رہی تھی۔ اُس کے دل کے نامعلوم گوشوں میں ایک آواز گونجنے لگی۔ تیری نجات کا یہی ایک ذریعہ ہے اور وہ فوراً اوپر پہنچ گیا ____ اور اس نے اپنی نئی زندگی کی وہ پہلی رات جیت لی۔ رات بھر عذرا کا خیال اُس کے پاس نہ آیا۔ اور انوری کے مہکتے ہوئے گیسوؤں کے سائے میں اس نے صبح کر دی۔ مگر صبح ہوتے ہی اُسے پھر عذرا کی یاد آنے لگی ____ اور پھر شام کو ایسا ہوا کہ وہ اپنے دوست راشد کے یہاں گیا ____ راشد

شراب پی رہا تھا ـــــــ اُس نے پرویز کو بھی حسب معمول دعوت دی، مگر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُس نے دیکھا کہ پرویز نے جو ہمیشہ شراب کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتا تھا بلا حیل و حجت شراب پی لی ـــــــ ایک ہی جھکتے ہوئے کیف آور جام نے پرویز کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا ـــــــ اُس نے ایک جام اور پی لیا اور کیف و سرور کے عالم میں اُس نے راشد کو اپنی تمام داستان سنا ڈالی۔ راشد بہت خوش ہوا۔ دوسرے شرابیوں کی طرح پرویز بہکا بھی نہیں۔ وہ گھر آکر کوئی کتاب دیکھنے لگا ـــــــ اور اُسے بڑا تعجب ہوا کہ اُس کے خیالات جو اِدھر اُدھر بھٹکتے رہتے تھے، آج ایک مرکز پر جمع ہو گئے تھے ـــــــ اس کے بعد روزانہ شراب پینا اور "بازاروں" کی سیر کرنا اس کا معمول ہو گیا ـــــــ ایک جانب راشد اس کی کفالت کرتا تھا، اور دوسری طرف انوری کی آنکھیں اس کے لئے فرشِ راہ تھیں۔ اب نہ اُسے عذرا کی یاد آتی تھی ـــــــ اور نہ بے کیفی و تنہائی کا شکوہ تھا اُسے دو بہت بڑے رفیقِ زندگی مل گئے تھے۔ "شراب اور عورت" ـــــــ اور جب بھی اس کو اپنی گزشتہ زندگی یاد آنے لگتی اسے یقین ہو جاتا کہ اس نے وہ دن ایک جھوٹی محبت میں گزارے تھے۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچ چکا تھا کہ یا تو دنیا میں محبت کا وجود ہی نہیں یا اگر ہے تو آسمانی فضاؤں میں ہے۔ جو اس کی دسترس سے دور ہیں۔

اب پرویز کے رات اور دن دونوں خوشگوار تھے۔ وہ ہر وقت بشاش نظر آتا تھا۔ دوستوں کے ساتھ ساتھ قہقہے لگاتا اور سب اس کی فطرت میں تبدیلی دیکھ کر حیرت میں رہ جاتے ـــــــ وہ ایک وادی سے نکل کر بلندی پر پہنچ چکا تھا

جہاں سے دیکھنے پر وادی کا منظر بہت گھناؤنا نظر آتا تھا۔ اور وہ اس وادی کا استقبال ہمیشہ ایک طنزیہ مسکراہٹ سے کیا کرتا تھا۔

اُس نے اپنی ناکام محبت کا "ردعمل" تلاش کر لیا تھا۔ اب وہ زندگی کی شاہراہ پر بڑی کامیابی سے دوڑ رہا تھا ــــــ اُس کو خوشی تھی کہ وہ ایک جھوٹی محبت کے طلسم سے بغیر زندگی کی قربانی دیئے نکل گیا۔

شکست

شکست

اس کے آتے ہی ہوٹل کی بے رنگ فضا میں جیسے زندگی کی لہر دوڑ گئی ـــــ ـــــ شہر کے ایک بارونق حصے میں ہوٹل تھا۔ بہت عالی شان مگر مختصر۔ اس میں صرف پندرہ کمرے تھے۔ پورے ہوٹل میں بڑے بڑے فوجی اور سول افسر ٹھہرے ہوئے تھے۔ کوئی آئی سی ایس۔ کوئی پی سی ایس اور کوئی کرنل اور لفٹیننٹ۔ ہوٹل بھر میں کوئی عورت نہیں تھی۔ نہ ملازمہ اور نہ مسافر۔ اور یہی وجہ تھی کہ جب شانتا اس ہوٹل میں آئی۔ تو ہر شخص کے چہرے پر بشاشت کے آثار نمایاں ہو گئے۔ گویا ان کو زندگی کی کرن ہاتھ لگ گئی ہو۔

شانتا جب اپنے ماں باپ بھائی بہن کے مر جانے پر تنہا رہ گئی تو اس کا جی چاہا کہ وہ بھی اپنی زندگی کا خاتمہ کر لے۔ مگر ایسا کرنے کے لئے اس میں ہمت نہ تھی

مجبوراً اس نے اپنی زندگی گزارنے کے لئے ایک عارضی ملازمت کر لی۔ وہ اپنے مکان کو چھوڑ دینا چاہتی تھی۔ کیونکہ اس کے آس پاس سب گھر خالی ہو چکے تھے۔ ان مکانوں کے بسنے والے موت کی نیند سو چکے تھے۔ اور جو باقی تھے وہ دم توڑ رہے تھے۔ اس کو اس گھٹے ہوئے ماحول سے نفرت تھی۔ اس کی زندگی تلخ تھی۔ اور آخر کار تنگ آ کر اس نے گرانڈ ہوٹل میں ایک کمرہ کرایہ پر لے لیا۔ وہ دن بھر دفتر میں کام کرتی تھی۔ جہاں سے اس کو اتنی قلیل آمدنی ہوتی کہ وہ بڑی مشکل سے اپنا گزارہ کر سکتی تھی۔ وہ اکثر سوچا کرتی، کہ نہ جانے کیوں وہ اتنے بڑے آسمان کے نیچے ظلم سہنے کے لئے زندہ رہ گئی ہے۔

وہ جوان تھی۔ اگر چاہتی تو بڑی آسانی سے اپنی زندگی سنوار سکتی تھی۔ مگر اس کی غیرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ وہ کسی کی منت کش ہو۔ وہ بڑی خوددار تھی۔ کسی کے آگے دست سوال پھیلانا وہ اپنی ہتک خیال کرتی تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ ہوٹل میں رہتے ہوئے ہوٹل سے الگ رہتی تھی۔ بس رات بسر کر لینے کے لئے وہ ہوٹل کا سہارا لیتی تھی۔ وہ کسی سے مدد نہ لینا چاہتی تھی۔ ورنہ اس کے لئے امداد کا مہیا ہو جانا کوئی مشکل بات نہ تھی۔ ہر ایک کی آنکھیں اس کے لئے فرشِ راہ تھیں۔ اس کے ایک ذرا سے اشارے کی دیر تھی اور اسی اشارے سے اس کو نفرت تھی۔ پھر اس میں ایک بیسوا میں فرق ہی کیا رہ جاتا؟۔

پہلے روز جب وہ اس ہوٹل میں آئی تو اسے لوگوں کی نگاہیں بار محسوس ہوئیں کرسیوں پر بیٹھے ہوئے امریکی اور انگریز فوجی اور حد تو یہ ہے کہ اس کے ہم وطن سپاہی تک اسے گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔ جیسے وہ سب مل کر اسے کھا جائیں گے،

یا جیسے وہ عجائب خانہ کی کوئی نادر چیز ہو۔ جسے سب حیرت اور حسرت سے دیکھ رہے تھے۔ ہر طرف اسی کے بارے میں چہ میگوئیاں اور سرگوشیاں۔ وہ سب سن رہی تھی۔ مگر برداشت کر رہی تھی۔

"یار مال اچھا ہے" ایک کہتا

"ہاں یار اس میں تو کوئی شک نہیں"

"بچ کے جائے گی کہاں؟" کسی اور میز سے آواز آتی۔

اسے اپنے بارے میں لوگوں کی یہ رائے سن کر بڑا غصہ آیا۔ اور غصہ کا پارا اس وقت اور چڑھ گیا۔ جب اس نے دیکھا کہ ہوٹل کے تمام بیرے کام چھوڑ کر اس کو تاک رہے تھے۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ اس ماحول سے فوراً الگ ہو جائے کسی اور ہوٹل میں ٹھہرے۔ مگر پھر اس نے خود ہی سوچا کہ وہاں بھی یہی فضا ہوگی۔ یہی کمینی مخلوق وہاں بھی ملے گی۔ اور پھر وہ کہیں نہ گئی۔ اس نے اپنے زخمی دل کو یہ کہہ کر تسکین دی کہ آخر مجھے ان سب سے لینا ہی کیا۔ وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہے۔ اسے ان سب سے مطلب ہی کیا؟۔

آمدنی قلیل ہونے کی وجہ سے اس نے کسی اور معمولی سے ہوٹل میں اپنے ناشتہ اور کھانے کا انتظام کر لیا تھا۔ مگر وہاں ٹھہرنے کی جگہ نہ تھی۔ دن بھر وہ دفتر میں رہتی۔ اور شام کو کھانا کھا پی کر "گرانڈ ہوٹل" میں آجاتی۔ وہ تھکی ہاری پریشان آتی اور اس کے آتے ہی ہوٹل کی فضا میں ہلچل سی مچ جاتی۔ مگر وہ اپنے کمرے میں پہنچ کر دروازہ بند کر لیتی اور لیٹ رہتی۔ کچھ پڑھتی پڑھاتی۔ اور سو جاتی۔ پھر کہیں صبح کو جا کر وہ اپنا دروازہ کھولتی ——— وہ بھی اس لئے کہ اسے دفتر جانا ہوتا۔

ثنا ثنا کے اس عجیب رویہ کے متعلق ہر طرف چہ میگوئیاں تھیں۔
سب یہ معلوم کرنے کے لئے بے چین تھے کہ وہ آتے ہی اپنے کمرے کا دروازہ کیوں
بند کرلیا کرتی ہے۔ اور وہ اندر رہ کر کیا کیا کرتی ہے۔ مگر کوئی اس کا راز نہ پاسکا۔ وہ
سب کیلئے ایک معمہ۔ ایک طلسم بن کر رہ گئی تھی۔
ثنا ثنا ایک مشین کے پرزے کی طرح بن کر رہ گئی تھی۔ جو ہر وقت ایک
ہی سا کام کیا کرتا ہو۔ اس کی زندگی ایک ہی راہ پر بسر ہو رہی تھی۔ نہ کہیں نشیب
اور نہ فراز۔ نہ موڑ نہ خم۔ اس کی دنیا مستقل درد و کرب تھی۔ کہیں کوئی رنگینی اور دلچسپی
نہیں۔ کوئی جذباتی احساس نہیں۔ وہ ان سب سطحی چیزوں سے بہت بلند تھی۔ اس
کی شدت احساس اسے زندگی کے ایک نئے اور بلند افق پر دیکھنے کے لئے مجبور
کرتی تھی۔ اس کی نظر میں ہوٹل کے تمام مسافر جذبات پرست تھے۔ اور جن کی
ثنا ثنا کی نظر میں کوئی حقیقت نہ تھی۔ اسے ہوٹل کے ہر فرد سے نفرت تھی کیونکہ
سب ہی اسے ہوس کارانہ نظر سے دیکھتے تھے۔
وہ ہوٹل میں داخل ہوتی تو شراب پیتے ہوئے فوجیوں کے جام ایک لمحہ
کے لئے رک جاتے۔ بیرے اپنا کام چھوڑ کر اسے تاکنے لگتے۔ اور یہ سب مخلوق
اس کو اس وقت تک تاکتی رہتی۔ جب تک وہ اپنے کمرے میں پہنچ کر اپنا دروازہ
نہ بند کرلیتی۔ اور اس دوران میں وہ لوگوں کی عجیب عجیب باتیں سنتی۔
"شکار پھنستا نظر نہیں آتا"، ایک کہتا
"ہاں یار! معاملہ کچھ ٹھیک بیٹھ نہیں رہا ہے"، دوسرا بولتا
"ارے ایک نہ ایک دن قلعہ فتح ہو کر ہی رہے گا" کوئی پورے وثوق

سے کہتا۔

اس کے کانوں میں جب یہ آوازیں گونجتیں تو اس کا جی چاہتا۔ کہ زہر کھا کر مر جائے۔ یا پھر خود کو ہگلی کی موجوں کے سپرد کر دے۔ لیکن پھر وہ یہی سوچ کر رہ جاتی کہ دنیا کی زبان کون روک سکتا ہے۔ اور پھر وہ اس کا کر ہی کیا سکتے تھے۔

اور پہلے پہل تو اس کے ہم وطن سپاہیوں نے بھی اس کو بیسوا سمجھ کر نفرت کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ اور جذبات کی تسکین کا ایک ذریعہ سمجھ بیٹھے تھے۔ مگر جب انھوں نے شانتا کے رہن سہن کا مطالعہ کیا۔ اس کے چہرے پر غم اور فکر کے آثار پائے تو ان کو اس سے ہمدردی پیدا ہو گئی۔ وہ اس کے بارے میں معلوم کرنا چاہتے تھے کہ کون ہے؟ کیا کرتی ہے؟ انھیں یہ برا معلوم ہوتا تھا کہ ایک ہندوستانی عورت اس طرح آکر ہوٹل میں ٹھہرے جہاں طرح طرح کے لوگ رہتے ہیں۔ مگر کبھی ان کو جرأت نہ ہوئی کہ وہ شانتا سے کچھ بات چیت کرتے۔

شانتا کی نظر میں اس کا اتنی بڑی دنیا میں کوئی ہمدرد نہ تھا۔ جو اس سے ہمدردی ظاہر کرتا۔ اس سے شانتا کو مارِ آستین کا خوف ہونے لگتا۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ کسی کو اپنا راز نہ بتاتی تھی۔ بلکہ وہ خود تمام ہوٹل کے لئے ایک بڑا راز بن کر رہ گئی تھی۔ سب کو حیرت تھی کہ وہ نہ ہوٹل میں کھانا کھاتی ہے۔ نہ ناشتہ کرتی ہے نہ گھومنے جاتی ہے۔ اور نہ کسی سے ملتی ہے۔ عجیب قسم کی عورت ہے۔ اس قسم کی معلومات ہوٹل کے بیرون سے خوب فراہم کرتے ہیں۔ مگر شانتا کے بارے میں وہ اس سے زیادہ کچھ نہ بتا سکے کہ وہ کسی دفتر میں ملازم ہے اور بس۔

اور پھر اس کی عارضی ملازمت کی مدت ختم ہوگئی ۔ اس نے اِدھر اُدھر بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر کوئی ملازمت نہ مل سکی ۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ زندہ رہے یا مر جائے ۔ جس ہوٹل میں کھانا کھاتی تھی وہاں کچھ مقروض بھی ہوگئی تھی ۔ اس کی خودداری نے یہ گوارا نہ کیا کہ وہ کسی سے مدد طلب کرے ۔ اور مجبوراً وہ اپنا کمرہ بند کرکے لیٹ رہی ۔ بھوک کی برچھیاں اس کے قلب کو چھلنی کئے دے رہی تھیں ۔ مگر وہ سب کچھ برداشت کرتی رہی ۔

وہ تین روز تک کسی کو نظر نہ آئی ۔ عام خیال تھا کہ وہ کہیں اور چلی گئی اور سب کو اس کے چلے جانے کا تردد تھا ۔ مگر کسی نے بتایا کہ اس کا کمرہ اندر سے بند ہے اور ایک لمحہ بھر میں پورا ہوٹل اس کے کمرے کے دروازہ پر جمع تھا ۔ سب اس کے راز کو معلوم کرنے کے لئے بے چین تھے ۔ آگے آگے اس کے ہم وطن سپاہی تھے جن کو شانتا سے ہمدردی تھی ۔ اور ان کے پیچھے بیسیوں فوجی تھے ۔ جن کو امید تھی کہ آج وہ ضرور شانتا سے بات چیت کریں گے ۔ اور پھر شکار ان کے ہاتھوں سے نکل نہ سکے گا ۔ اور ان فوجیوں کے پیچھے پورا ہوٹل شور مچا رہا تھا ۔

دروازہ پر دستک دی گئی ۔ مگر کوئی جواب نہ ملا ۔ کواڑوں کو زور زور سے پیٹا گیا ۔ مگر وہ بدستور بند رہے ۔ سب کا تعجب اور اشتیاق فزوں تر ہوتا گیا ۔ وہ آج اس راز کو معلوم کرلینا چاہتے تھے ۔ بڑی کوشش سے وہ دروازہ توڑنے میں کامیاب ہوگئے ۔ سب سے پہلے اس کے ہموطن داخل ہوئے اور ان کے پیچھے پورا مجمع ۔

شانتا کے کمرے کی فضا بڑی منتشر تھی۔ میز پر۔ کرسی پر اور فرش پر تمام کاغذات بکھرے پڑے تھے۔ بکس اور اٹیچی کیس کھلے پڑے تھے۔ کتابیں الٹی سیدھی اس کی میز اور الماریوں میں ڈھیر تھیں۔ اور وہ خود ایک کونے میں اپنی مسہری پر بے حس و حرکت پڑی تھی۔ ہاتھ پیر سرد تھے۔ اور نبض کی رفتار کا پتہ نہ چلتا تھا۔

"مر گئی بے چاری"، سب کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ مگر اس کے ہم وطن سپاہیوں کی تسکین نہ ہوئی۔ وہ شانتا کو زندہ دیکھنا چاہتے تھے۔ اس کی زندگی کے راز کو معلوم کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے ڈاکٹروں سے مشورہ لیا۔ اور ڈاکٹروں نے بتایا کہ "کمزوری اور فاقہ کشی کی شدت کی وجہ سے وہ بیہوش ہو گئی ہے۔ آرام کی سخت ضرورت ہے۔ حالت خطرناک ضرور ہے۔ لیکن جلد ٹھیک ہو جائے گی۔"
اور چند روز بعد شانتا نے آنکھیں کھول دیں۔

اور اس کے ہم وطن سپاہی کتنے خوش تھے۔ انھوں نے روحِ انسانیت کو اس کے اصلی روپ میں دیکھ لیا تھا۔ شانتا نے ہندوستانیوں کی لاج رکھ لی تھی۔ ہندوستانی سپاہیوں کو ایسا محسوس ہوا جیسے ان کے ماتھے سے برسوں کی ذلت کے داغ دھل گئے ہیں جیسے وہ ایک نئے ماحول اور نئی فضا میں سانس لے رہے ہوں۔ شانتا کی خودداری نے ان کی خودداری کی قندیلوں کو روشن کر دیا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ ہوس پرست انسانوں کو زبردست شکست دی تھی۔

منزل تک

منزل تک

اپنی منزل تک پہونچنے کے لئے روزانہ صبح سے شام تک اس کو اس راستے سے کئی بار گذرنا پڑتا تھا۔ وہ کسی دفتر میں کلرک تھا۔ جہاں اس کی ساری ادبی قدروں کا گلا آپ ہی آپ گھٹتا جا رہا تھا۔ وہ اس شہر میں نیا نیا آیا تھا۔ اتنے بڑے شہر میں مکان کی تلاش بے سود سی تھی۔ لہذا اس نے اپنے ایک دور کے عزیز کے وہاں جن کا مکان اس کے دفتر سے قریب تھا بود و باش اختیار کر لی۔ اس کے دفتر سے مکان کوئی چار سو قدم کے فاصلے پر تھا۔ اور روزانہ اس کو یہ تین چار سو قدم چلنا شاق گزرتا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا

کہ اس راہ پر چلنا چھوڑ دے۔ مگر نو وارد ہونے کی وجہ سے کوئی اور نزدیک کا راستہ معلوم نہ تھا۔

سویرے سویرے جب وہ تازہ دم ہو کر گھر سے دفتر جانے کیلئے نکلتا تو اس سڑک پر آتے ہی اس کی طبیعت پژمردہ ہو جاتی۔ زندگی کی ارزانی دیکھ کر اس کے آنسو بھر آتے ——— اور پھر سڑک ——— اچھی خاصی شاہراہ ہونے کے باوجود میونسپلٹی کی بے پروائی کی وجہ سے ایک ویران گلی کی صورت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ شروع سے آخر تک بڑے بڑے گڑھے، کنکر اور پتھروں کے ڈھیر ——— کہیں نشیب کہیں فراز ——— اور جب بارش ہو جاتی تو پوری سڑک پر گھٹنوں گھٹنوں تک پانی بھر جاتا ——— راہ بند ہو جاتی تھی۔ مگر اس کے باوجود اس کو جانا پڑتا تھا ——— اور نہ جاتا تو کرتا بھی کیا ——— کئی بار اندھیری رات میں وہ اس سڑک پر گرتے گرتے بچا، اور کیچڑ کی وجہ سے کپڑے تو روزانہ ہی خراب ہو جاتے تھے۔

سڑک پر اس کو عجیب قسم کی زندگی نظر آتی تھی ——— اپنے گھر کے زینے سے اترتے ہی جب وہ سڑک پر آتا تو ہمیشہ اس کو موڑ پر ایک فقیر بیٹھا نظر آتا ——— جو اس کو دیکھتے ہی "بابو جی ایک پیسہ" کی آوازیں لگانے لگتا ——— کہنے کو وہ فقیر تھا مگر صورت سے بالکل بیکس و مجبور نہ معلوم ہوتا ہے۔ اس نے سینکڑوں دفعہ اسی فقیر کو سگریٹ پیتے دیکھا تھا ——— اور ایک بار تو وہ نشہ کی ترنگ میں بھی کچھ عجیب طرح بڑبڑا رہا تھا۔

"نہ دو بھیک! نہ دو بھیک!!" اور پھر ذرا رک کر "میں کسی سے کچھ نہیں مانگتا میری جیب میں خود روپے ہیں"۔

اور اس دن سے اس کو اس فقیر سے نفرت ہو گئی تھی۔

سڑک پر جانے کس نسل کے لوگ آباد تھے کہ جن کو تہذیب کی ہوا چھو بھی نہیں گئی تھی۔ وہ سڑک کے کنارے اپنے چھوٹے اور گندے مکانوں میں رہتے تھے۔ مگر ان کا زیادہ وقت بجائے مکانوں کے سڑک ہی پر گذر جاتا تھا۔ دونوں طرف کے مکانوں کی ٹوٹی پھوٹی چارپائیاں سڑک پر پڑی رہتیں۔ اور ان پر بیٹھے ہوئے مرد اپنے کالے کالے جسموں سے میل چھڑاتے اور بھدی بھدی گالیاں بکتے رہتے۔ اور کبھی عورتیں ان چارپائیوں پر لیٹی ہوئی اپنے کم عمر گوشت کے جاندار لوتھڑوں کو دودھ پیاتی رہتیں۔ دنیا سڑک پر سے گذر جاتی مگر وہ اپنی چھاتیاں کھولے ہوئے اسی طرح لیٹی رہتیں۔ گویا دنیا سے شرم و حیا کی قدریں بالکل اٹھ گئی ہیں۔

وہ اکثر سوچا کرتا کہ اس چھوٹی سی گلی میں چار پانچ سو بچے کہاں سے آ گئے۔ کھانے پینے کو نصیب نہیں اور بچوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جاتا تھا۔ اور پھر بچے بھی عجیب عجیب قسم کے ——— دنیا کے عجائب خانوں میں رکھ دینے کے قابل۔ کوئی کالا اور چنگبرا کسی کی صورت بالکل بندر سے مشابہ اور کوئی لومڑی کی صورت لئے ہوئے ——— آٹھ برس کی عمر کے تمام بچے ننگے ننگے پوری سڑک کا چکر لگاتے رہتے۔ اور بہت سے بچے قطار بنائے سڑک کے کنارے بہتی ہوئی نالی میں غلاظت کا اضافہ کرتے رہتے۔ اور جو بچے چلنے نہ پاتے تھے ——— نالی تک پہونچ نہ سکتے تھے۔ ان کی مائیں ان کو اپنے پاؤں پر بٹھا کر سڑک پر غلاظت پھیلانے میں مدد دیتی تھیں۔ بچوں کے ساتھ مردوں اور عورتوں کی اتنی ہی بہتات تھی۔ سب ایک دوسرے سے بڑھ کر جاہل، اجڈ اور گنوار۔ عورتیں دن بھر اپنے کئی کئی بچوں کو چمٹائے ہوئے سڑک کے کنارے پاؤں پھیلائے بیٹھی رہتیں۔ جیسے ان کو دنیا کا کوئی اور کام ہی نہیں ہے ———

ہر وقت گالیاں اور باتیں ——— باتیں اور گالیاں ——— گویا ان کی زندگی انھیں دو دائروں میں سمٹ کر رہ گئی ہو۔ بچے پیدا کرنا، ان کی سیوا کرنا، اپنا پیٹ بھرنا اور پھر باتیں کرنا ——— ان کے علاوہ ان کی زندگی میں کوئی تلوّن نہ تھا ——— کوئی جاذبیت نہ تھی ——— زندگی کا مفہوم ان کے نزدیک اس سے زیادہ نہ تھا۔ جتنا وہ سمجھتی تھیں۔ اور جو نوجوان قسم کی لڑکیاں تھیں ——— وہ بھی عجیب بے پروا ——— بالکل اپنی ماؤں کی بنائی ہوئی لکیروں پر چلنے والی ——— نہ شرم نہ حیا ——— نہ جوانی کا ہوش، نہ بھدّے حسن کا حجاب ——— لڑ رہی ہیں گالیاں بک رہی ہیں ——— زبان قینچی کی طرح چل رہی ہے ——— "حرامی کے بچے ——— ! سور کے پِلّے ———" اور اسی قسم کی دوسری گالیاں ان لڑکیوں کو خوب یاد تھیں۔

اور وہ دیکھتا کہ سڑک پر مردوں کے غول عورتوں سے الگ اپنے اڈے جمائے بیٹھے رہتے ——— بہتوں کے ہاتھ میں رنگی ہوئی لال لال بٹیریں۔ اور جن کے سروں کو وہ لوگ بار بار اپنے پان کھائے ہوئے منہ میں ڈال کر اور لال کرتے رہتے اور جب وہ ان بٹیر بازوں کو یہ حرکت کرتے ہوئے دیکھتا تو اسے گھن آنے لگتی جیسے ابھی قے ہو جائے گی ——— وہ جلدی سے ان بٹیر بازوں کی طرف سے اپنا منہ پھیر لیتا ——— مردوں میں مشکل سے دو فیصدی ایسے لوگ تھے جو مشکل سے اردو کی پہلی دوسری کتاب اور الٹا سیدھا قرآن شریف پڑھ سکتے تھے۔ اور یہی دو فیصدی لوگ اس سڑک کے قرب و جوار میں سب سے زیادہ قابل، پڑھے لکھے اور سند یافتہ سمجھے جاتے تھے ان کی باتیں سب کے لئے حدیث سے کم مرتبہ نہ رکھتی تھیں۔ مولانا جو ٹھہرے۔ عالم جو گردانے گئے ——— ہر مسئلہ کے متعلق ان سے ہی رجوع کیا جاتا ——— اور وہ اس پندار

سے جواب دیتے گویا دنیا کے تمام علوم سے بہرہ یاب ہوں ——— ہاں منہ پر لمبی داڑھیاں جو تھیں ——— مذہب کے ٹھیکہ دار جو مانے گئے۔

"مولانا صاحب!" کوئی سوال کرتا "اگر بغیر سحری کھائے روزہ رکھا جائے تو کوئی نقص تو واقع نہیں ہوتا"۔

اور وہ بڑے پندار اور تیقن سے جواب دیتے۔ "حدیث شریف میں تو یہ آیا ہے کہ روزہ حرام ہو جاتا ہے لیکن کلام پاک کی تفسیر سے ثابت ہو جاتا ہے کہ اگر سورج نکلنے سے پہلے روزہ کی نیت کر لی جائے تو کوئی نقص واقع نہیں ہوتا"۔ اور پھر وہ اس مسئلہ کو اتنا طول دیتے، اتنی وضاحت کرتے کہ چاروں طرف سے لوگ سمٹ کر ان کے اردگرد جمع ہو جاتے۔ دوکاندار اپنے گاہکوں کی طرف توجہ کم کر کے مولانا صاحب کے وعظ پر اپنے کان لگا دیتے۔ اور تمام بچے محض یہ دیکھنے کے لئے کہ مجمع میں کیا ہو رہا ہے مولانا کے اردگرد آ کر جمع ہو جاتے۔ اور شور مچانے لگتے۔ اور پھر بچوں میں آپس میں لڑائی ہونے لگتی۔ گالیاں شروع ہو جاتیں اور پھر ہاتھا پائی تک نوبت پہنچ جاتی۔ تڑاق ——— تڑاق کی آوازیں آنے لگتیں، اور مولانا کا وعظ درہم برہم ہو جاتا ———

اور اکثر رات کو جب وہ نو دس بجے اس سڑک پر سے گذرتا تو سڑک پر کہیں کہیں چارپائیاں اتنی قریب بچھی ہوتیں کہ اس کو گذرنے میں بڑی زحمت اٹھانی پڑتی ——— کہیں کہیں دوکان پر جمگھٹا لگا ہوتا، کوئی صاحب اسٹول پر بیٹھے ہوئے آلہا اودل سناتے ہوتے اور اونگھتا ہوا مجمع تعریف کر رہا ہوتا ——— اور اس سڑک پر دوکانیں ہی کتنی تھیں ——— گنتی کی چند ——— وہ بھی صرف چائے پان اور سگریٹ کی ——— معلوم نہیں اس ذرا سی سڑک پر چائے کی سات آٹھ دوکانیں کیوں تھیں۔ جیسے ان گندے

لگی ہوئی تھیں جو دھوئیں کی کثرت سے بڑی مشکل سے تصویریں کہی جا سکتی تھیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مولانا چھبن کی عدم موجودگی میں اکثر ان کی لڑکی رجو آ کر دوکانداری کرتی تھی ——— اس کا نام غالباً راضیہ تھا۔ کافی جاذب توجہ تھی جب وہ دوکان پر ہوتی تو گاہکوں کا مجمع بڑھ جاتا ——— مگر وہ لڑکی عجیب قسم کی تھی ——— علاوہ چائے دینے اور پیسے لینے کے وہ کوئی بات ہی نہ کرتی تھی ——— کوئی کچھ لگاوٹ کی باتیں بھی کرتا تو وہ بے توجہی سے ٹال دیتی ——— اور ایک روز اس کا جی چاہا کہ وہ بھی چھبن صاحب کی دوکان پر چائے پیئے۔ لیکن جانے کیوں اس کو دوکان میں داخل ہوتے ہوئے جھینپ سی آنے لگی۔ کیونکہ دوکان پر اس وقت راجو بیٹھی ہوئی تھی۔ مگر وہ ہمت کر کے اندر داخل ہوا۔

"کیا چاہیے؟" راجو نے اس طرح سوال کیا گویا ڈانٹ رہی ہو۔

"چائے" اس نے کہا اور ایک کرسی پر خاموشی سے بیٹھ گیا۔

اور رجو پورے انہماک سے چائے بناتی رہی۔ وہ اس کو دیکھتا رہا۔ چائے بنا کر وہ میز پر رکھ گئی۔ وہ پینے لگا ——— کوئی اور گاہک نہ تھا ——— رجو آ کر دوسری بنچ پر بیٹھ گئی ——— اور عجیب بے پروائی سے میز پر اپنے کھردرے ہاتھوں سے نقاب دینے لگی۔ اس کی رجو کی یہ بے وقت کی راگنی بہت بری معلوم ہوئی۔ اس نے ارادہ کیا کہ اس کو منع کرے مگر جانے کیوں وہ کچھ کہہ نہ سکا۔ چائے پی کر وہ جلدی سے دوکان سے نیچے اتر آیا گویا کوئی اس کے تعاقب میں ہو۔

عجیب لڑکی ہے رجو بھی، وہ سوچنے لگا۔ سولہ سترہ برس کی عمر۔ بھرپور جوانی اس قدر بے پروا بچوں کے ساتھ کھیلتی رہتی ہے جیسے وہ بھی دودھ پیتی بچی ہو۔ بچوں سے

مکانوں کے رہنے والے سب کے سب انھیں ہوں۔ اور پھر چائے کی دوکانوں کے مالک بھی کچھ عجیب قسم کے۔ کوئی غنڈا معلوم ہوتا تو کوئی پہلوان —— کوئی فقیر اور کوئی چور —— ان سب میں چھبن صاحب کی دوکان ذرا قاعدے کی تھی —— مگر انکا حلیہ بھی عجیب قسم کا تھا —— زرد رنگ کی ایک تہمد جس کو وہ لنگوٹی کی طرح باندھے رہتے ناک پر دھاگے سے بندھا ہوا زنگ آلود چشمہ رکھے۔ جس کے شیشے اتنے میلے ہو گئے تھے کہ شاید ہی چھبن صاحب کو ان سے دکھائی دیتا ہو۔ وہ ہر وقت چولھا پھونکتے نظر آتے تھے —— وہ ذرا مولانا قسم کے آدمی تھے۔ شاید کسی بڑے پیر کے مرید بھی تھے۔ اسی لئے اتنی لمبی زلفیں رکھ چھوڑی تھیں کہ اگر ان کی چوٹی گوندھی جاتی تو کمر تک ضرور آتی۔ داڑھی اور مونچھیں بہت بڑی بڑی اور الجھی ہوئی۔ وہ ہر وقت بہت مصروف نظر آتے۔ اور اسی طرح ہر چائے فروش میلا کچیلا ننگ دھڑنگ بیٹھا نظر آتا۔ ہر وقت مکھیوں کے غول کے غول اڑتے رہتے، بھنبھناتے رہتے اور دوکانوں کے آس پر کتے منڈلاتے رہتے دوکاندار خریداروں سے زیادہ اپنے محلے والوں کی باتوں پر توجہ دیتا —— یہ بڑی عجیب بات تھی۔ مگر اس سڑک پر ہر چیز عجیب جو ٹھہری —— اکثر ایسا ہوتا کہ دوکان پر گاہک آتے اور دوکاندار اپنے محلے کے دوستوں سے باتیں کرنے میں اتنا محو ہوتا کہ بیچارہ گاہک تھوڑی دیر کھڑا رہ کر واپس چلا جاتا اور دوکاندار کو ہوش نہ آتا —— اکثر اوقات چھبن صاحب کی دوکان پر بھی گاہکوں کے ساتھ بھی سلوک ہو جاتا مگر اس کے باوجود سب سے زیادہ جاذب نظر اور کشش انگیز ان کی ہی دوکان تھی —— اس کی کئی وجوہ تھیں —— وہ تجارت کے گر سے واقف تھے۔ ان کی دوکان میں دوسری دوکانوں کے خلاف بجائے بنچوں کے دو ایک کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ دو ایک تصویریں بھی

لڑائی بھی لڑ لیتی ہے۔ گالیاں بکتی ہے، بے حیا، بے شرم۔ نسوانیت نام کو نہیں۔ پورا لڑکا ہے بالکل لڑکا۔

اور اکثر جب وہ اس سڑک پہ سے گذرتا تو بہت سی لڑکیاں اس کی پوشاک، اس کی صورت اور اس کے ہاتھوں میں فائل کے پلندے پر رائے زنی کرنے لگتیں وہ کن انکھیوں سے سب کچھ دیکھتا مگر خاموش گذر جاتا۔ وہ لڑکیاں اس کی شخصیت پر آپس میں اظہار رائے کرتیں۔ مگر محض اشاروں میں ـــــ مگر اسے ان اشاروں سے نفرت تھی ـــــ ان لڑکیوں سے الجھن ہوتی تھی۔ وہ اس سڑک کے ذرہ ذرہ سے متنفر تھا۔ مگر اسی سڑک پہ چلنے کے لئے مجبور تھا۔

وہ اکثر سوچا کرتا کہ اس سڑک پر بجانے اتنی گائے بھینس کہاں سے آجاتی ہیں ـــــ راستہ چلنا دشوار کر دیا ہے ـــــ ہر طرف ان کے بھاری بھاری قوی ہیکل جسم دیوار چین کی طرح آنے جانے والوں کا راستہ روکے رہتے ـــــ جو تھوڑا بہت راستہ بچ جاتا اس پر ان کی غلاظت کا انبار پڑا ہوتا۔

اکثر وہ دیکھتا کہ سڑک کے کنارے کنکروں اور پتھر کے ڈھیر پر مرد چھوٹی چھوٹی بیڑھیاں بجھائے بیٹھے رہتے۔ اور ان کے قریب ہی عورتیں ٹوکریوں میں سڑے گلے پھل لئے بیچا کرتیں۔ پھلوں میں ہر قسم کے پھل تھے جو غریب لوگ کھا سکتے تھے مثلاً امرود، کیلے، کھیرا اور اعرس وغیرہ مگر ہر چیز سڑی، باسی اور بدبودار ـــــ تمام دن مکھیوں کے قافلے ان پھلوں پر بھنبھناتے رہتے۔ اور ان کاہل عورتوں کے ہاتھ بھی نہ اٹھتے تھے کہ ان مکھیوں کو اڑا دیں۔ مگر انھیں ایسا کرنے کی ضرورت بھی کیا تھی کیونکہ ان کے پھلوں کے گاہک ہی کون تھے۔ یا ان کے شوہر ٹوکری پہ ہاتھ صاف

کرتے رہتے یا پھر ان کے بچے رو رو کر، ضد کر کے دو چار پھل اڑا لے جاتے ــــــ اور اگر اس کے بعد بھی ٹوکری میں کچھ پھل بچ جائے تو کوئی فقیر اللہ کی راہ پر مانگ لیتا۔ یا کبھی کبھار ایک آدھ پیسے کی خرید لیتا ــــــ

اس کو اس سڑک کے تمام منظر سے نفرت سی ہو گئی تھی ــــ اس کا جی چاہتا تھا کہ تمام روتے ہوئے، منہ بسورتے ہوئے بچوں کا گلا گھونٹ دے ــ عورتوں کو تہہ تیغ کر دے۔ اور مردوں کو جنگلوں میں بھیج دے ــــ کیونکہ ان کو شہر میں رہنے کا کوئی حق نہ تھا ــــ اور پوری سڑک پر لاوا پرائی سے گھومتی ہوئی گایوں بھینسوں کو حلال کر کے کھا لے یا پھر بندوق کا نشانہ بنا دے ــــ تاکہ اس کو سڑک پر آزادی سے چلنے کا موقع ملے۔

دُکھتے شانے

دُکھتے شانے

"ٹن ٹن ٹن .... " گھڑی نے گیارہ بجا دیئے، اور وہ اب تک بیدلی سے افسانوں کی ایک کتاب کے ورق اُلٹ پلٹ رہا تھا۔

جاڑے کی سرد اور لمبی راتیں۔ کسی کے لئے سہانی اور کسی کے لیے کتنی اذیت کوش۔ وہ ہوسٹل کے بالکل کونے والے کمرے میں تھا جہاں زندگی کی کرن معدوم تھی۔ اُس کے دونوں پارٹنر گرم گرم لحافوں میں پڑے سو رہے تھے مگر وہ جاگ رہا تھا۔ اسے نیند ہی نہ آتی تھی۔ اور افسانوں کی کتاب؟ وہ تو محض ایک بہانہ تھی جسے اس نے یونہی ہاتھ میں اٹھالیا تھا۔ کبھی یونہی ورق الٹنے لگتا، اور کبھی دیر تک نہ جانے کیا کیا سوچتا رہتا۔

کیا سوچتا تھا وہ ——؟ یہی اپنی زندگی کے مسائل جو کبھی سلجھ نہ پاتے تھے

وہ سوچنے لگا کہ اس کے غریب والدین نے اس کو یونیورسٹی میں اس لئے داخل کرایا تھا کہ وہاں سے کوئی افسر بن کر نکلے گا۔ ہزار پانسو تنخواہ ہوگی اور اُن کے بُرے دن دور ہو جائیں گے۔۔ اور اختر۔۔؟ سوچتا تو وہ بھی تھا اسی طرح کی باتیں مگر بس سوچ کر ہی رہ جاتا تھا۔ وہ تعلیمی دَور میں اپنے تمام ساتھیوں سے پیچھے تھا۔ کلاس میں داخل ہوتا تو ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ کلاس میں زبردستی دھکیل دیا گیا ہو۔ اور کلاس میں پہنچ کر بھی وہ سب سے پچھلی سیٹ پر بیٹھا کرتا۔ جیسے اس کے دل میں یہ خیال ہو کہ کہیں پروفیسر صاحب کی آواز اس کے کانوں تک نہ پہنچ جائے۔ مگر آخر ان کی آواز پوری کلاس میں گونجتی ہوئی اختر کے کانوں سے ٹکرا ہی جاتی اور اپنے خیالات سے چونک کر ایک لمحہ کے لئے وہ اپنے پروفیسر کی طرف دیکھنے لگتا۔ جیسے وہ یہ جاننا چاہتا ہو کہ اس نے لکچر میں کیا خاص بات کہی ہے۔ مگر وہ کبھی بھی کچھ نہ جان پاتا۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آتا اور وہ ایک لمحہ تک پروفیسر صاحب کی صورت دیکھ کر پھر اپنے خیالات میں الجھ جاتا یا پھر کلاس کی دیوار پر لگے ہوئے اُن تمام کتبوں کو پڑھنے لگتا جن میں ان امراء کے نام کندہ تھے جنھوں نے یونیورسٹی کی مالی امداد کی تھی۔ مگر جلد ہی وہ اس شغل سے بھی بیزار ہو جاتا کاپی کھول کر لکیریں سی کھینچنے لگتا۔ کبھی اپنا نام لکھتا اور کبھی ... ... یہاں تک کہ گھنٹہ بج جاتا اور وہ حاضری دینے کے بعد کلاس سے اس طرح نکلتا جیسے اس میں بالکل دم نہ رہا ہو۔ جیسے اس نے کلاس میں بڑی محنت سے پڑھا ہو۔ باہر نکلتے وقت وہ اتنا رنجیدہ اور مضمحل دکھائی دیتا جیسے برسوں کا مریض ہو۔

یہ تھا اس کی پڑھائی کا عالم اور اس کے دوست اسلم اور نسیم وغیرہ اس کو سمجھانے کہ "بھائی اختر اس طرح کام نہ چلے گا۔ یہ بی اے کلاس ہے۔ اب تک جیسے

پاس ہو گئے، ہو گئے مگر اب کے پل صراط سے گذرنا ہے" اور وہ ان باتوں کو تلخ گھونٹ کی طرح اتار لیتا۔ اور پھر دل میں سوچتا کہ واقعی یہ سب ٹھیک کہتے ہیں۔ اُسے یقینی پڑھنے کی طرف توجہ دینی چاہئے۔ اور کلاس کے بعد کمرے پر آتے ہی وہ کتابیں ٹھیک کر کے رکھ دیتا کہ شام سے پڑھائی شروع ہو گی مگر جب شام کو وہ پڑھنے بیٹھتا تو اس کو معلوم ہوتا کہ اس کے کورس کی تو کوئی کتاب ہی نہیں ہے۔ دو چار غیر درسی کتب پڑی ہیں۔ وہ بھی جانے کیوں۔ وہ سوچتا رہتا کہ آخر وہ کس طرح پڑھے۔ کتابیں کہاں سے لائے۔ اس کے والد کی تنخواہ میں اتنی بھی گنجائش نہ تھی کہ گھر کا خرچ آسانی سے چلتا۔ پھر بھلا وہ اختر کو کیا بھیجتے۔ وہ ٹیوشن کر کے پڑھتا مگر پھر بھی ٹیوشن اس کے تمام اخراجات کی کفیل ثابت نہ ہوتی۔

اس کے پاس صرف فارسی کی ایک کتاب تھی جو گذشتہ سال سے اس کے بکس میں بند رکھی تھی۔ اور آج جب وہ اس کتاب کو بکس سے نکالنے والا تھا تو اس کو یہ بھی نہ یاد تھا کہ وہ کتاب نثر کی ہے یا نظم کی۔ اس نے حافظہ پر زور دیا تو یاد آیا کہ وہ کتاب نثر کی ہے۔ مگر جب بکس کھولا تو وہ نظم کی نکلی۔ اس نے کتاب بکس سے نکال لی اور سگریٹ سلگا کر پینے لگا تا کہ اس کے بعد پڑھائی میں محو ہو جائے۔ اور سگریٹ پی کر اس نے کتاب کا پہلا صفحہ الٹ ہی دیا۔ مگر شعرا کی طویل فہرست ہی دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ اس نے اُن میں سے بہتوں کے تو نام بھی نہ سنے تھے۔ اور پھر اس نے اپنی کاپیوں کا جائزہ لینا شروع کیا تا کہ فارسی کے نوٹس مل جائیں۔ مگر اس نے کبھی نوٹس لکھے ہوں تو مل بھی جائیں۔ گذشتہ سال وہ اکثر و بیشتر فارسی کے کلاس میں جاتا رہا۔ مگر محض تفریح کی خاطر۔ کیونکہ اس کے فارسی کے لکچرار اتنے پُر مذاق تھے کہ ان کا کلاس چھوڑنے کو

جی نہ چاہتا تھا۔ اور کاہلی کی بنا پر اُس نے کبھی بھی نوٹس نہ لکھے۔ کبھی پنسل سے ایک کاپی پر لکھ لیا اور کبھی قلم سے دوسری پر، اور کبھی لکھا ہی نہیں۔ اور جب وہ سال بیت گیا تو وہ ایک اور مصیبت میں مبتلا ہو گئے۔ اب جو لکچرار صاحب ملے تو وہ بالکل عجیب سے تھے۔ لوگ انھیں قابل سمجھتے تھے مگر اختر کو تو کبھی ان کی قابلیت سے فیض پہنچا نہیں۔ جب وہ بولتے تو اختر کے کانوں کے پردے پھٹنے لگتے۔ ان کی جھٹکے کھاتی ہوئی آواز کلاس میں گونجتی ہوئی اس کے کانوں تک پہنچتی تو اس کا بھی جی چاہتا کہ کلاس سے اٹھ کر بھاگ جائے۔ وہ جو الفاظ ادا کرتے سب ایک ہی سانس میں۔ اور آخری چند الفاظ اتنی آہستہ سے ادا کرتے کہ بس خود ہی سُن پاتے ہوں گے۔ آخر اس نے ان کی کرخت آواز سے بچنے کا جواز یہ نکالا کہ کلاس میں کوئی دوسری کتاب پڑھا کرتا اور اس میں اتنا کھو جاتا کہ اُسے خبر ہی نہ رہتی کہ کیا پڑھایا جا رہا ہے۔

اور جب وہ اپنی کاپیوں میں فارسی کے نوٹس تلاش کر کے ناکام ہوا تو خود کوشش کر کے کتاب شروع کر دی۔ مگر پہلے ہی شعر میں وہ الجھ کر رہ گیا۔ عجیب عجیب قسم کے الفاظ تھے۔ جن کے معنی اس کے دماغ میں آ ہی نہ سکتے تھے۔ اُس کے پاس لغت ہوتی تو وہ اس مشکل کو حل کر لیتا۔ مگر آخر لغت ہوتی ہی کیوں۔ اُس نے دوسرا شعر پڑھا مگر وہ اس سے زیادہ مشکل نظر آیا۔ اور پھر اس نے کئی شعر ایک ساتھ پڑھ ڈالے مگر اس کی سمجھ میں خاک نہ آیا۔ اور آخر پچھتا کر اُس نے کتاب کو سلیقے سے اور کتابوں کے ساتھ میں رکھ دیا۔ اُس کا جی تو چاہتا تھا کہ کتاب پٹخ دے، پھینک دے یا پھاڑ ڈالے مگر اُس نے اس میں سے کچھ بھی نہ کیا۔ وہ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اپنی کتابوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا مگر میز اور الماری میں اس کے محبوب مصنفین، غالب، جوش

فراق اور کرشن چندر کی کتابوں کے علاوہ کوئی کتاب نہ تھی۔ اور یہ سب کتابیں اس کی پڑھی ہوئی تھیں۔ اور وہ سوچ رہا تھا کہ آج رات کو وہ کیا پڑھے اور تھوڑی دیر بعد اس کو یاد آیا کہ اسی روز اس کے پاس ریویو کے لئے افسانوں کی ایک کتاب آئی تھی۔ اُس نے اس مجموعہ کو اٹھا لیا۔

اور اب وہ کرسی سے اٹھ کر لحاف میں گھس گیا۔ اور کتاب پڑھنے لگا۔ ایک دو تین۔ وہ کئی کہانیاں پڑھ گیا۔ محض ایک کروٹ لیٹے لیٹے۔ اس نے کروٹ بدل لی اور سامنے میز پر پڑی ہوئی سگریٹ کی ڈبی کو ٹٹولا۔ ابھی اس میں کئی سگرٹیں تھیں۔ وہ سوچنے لگا کہ ابھی شام کو تو پورا پیکٹ خریدا تھا۔ اور اتنی جلد سات سگرٹیں پی گیا

وہ اپنی اس بری عادت پر دل ہی دل میں کڑھنے لگا۔ وہ اکثر سوچتا کہ اس کی آمدنی محدود اور اخراجات اتنے بڑھے ہوئے۔ کیوں نہ سگریٹ چھوڑ دی جائے۔ مگر وہ سوچ کر ہی رہ جاتا۔ وہ کبھی سگریٹ نہ چھوڑ سکا۔ وہ سوچنے لگا کہ مہینے کے آخر میں جب سگریٹ والے کا حساب بیس پچیس تک پہنچ جائے گا۔ تو وہ کہاں سے دے گا۔ گھر سے چوبیس روپے آئیں گے اُن میں وہ فیس داخل کرے یا سگریٹ کے دام دے اس کے ذہن میں انتشار سا برپا تھا۔ اس کے لئے اس کی سادہ زندگی بھی بار محسوس ہو رہی تھی۔

اس کے دونوں پارٹنر ترابی اور ماجد مزے کی نیند سو رہے تھے۔ کمرے کی منجمد خموشی میں اُن کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز ایک بے ربط سی ہلچل پیدا کر رہی تھی۔ وہ دونوں سو رہے تھے۔ خاص طور پر ترابی صاحب سے اُسے چڑ سی ہو گئی۔ اُس نے ان کو اپنے کمرے میں صرف اس لئے رکھنا منظور کر لیا تھا کہ وہ نئے نئے آئے

تھے۔ صورت سے بے چارگی اور مسکینی برستی تھی۔ دوسرے کمروں میں ممکن تھا لڑکے ان کو پریشان کرتے۔ مگر اب انھوں نے اپنی عادتوں سے خود اختر کو پریشان کر دیا تھا صبح جب اختر کی آنکھ کھلتی تو برنی صاحب کے نعروں سے جانے وہ خواہ مخواہ کیوں چڑھتے تھے۔

اور اس کے بعد فوراً پڑھنے بیٹھ جاتے۔ کھانے اور دو ایک ضروری کاموں کے علاوہ ان کا تمام وقت لکڑی کی کرسی پر بیٹھے کتاب پڑھتے گذر جاتا۔ ان کی اس عادت سے اختر کو کڑھن سی ہونے لگتی تھی۔ اور پھر یہی نہیں بلکہ وہ ہوسٹل کے طرز زندگی سے اس قدر ناآشنا تھے کہ اپنا تولیہ، صابن، تیل، کنگھا اور اس قسم کی دیگر اشیاء جو روزانہ استعمال میں آتی ہوں وہ ہمیشہ بکس میں رکھا کرتے تھے۔ اور اختر اور ماجد ان کو ہوسٹل کے رہن سہن کا طریقہ بتانے کے لئے اکثر اپنی چیزیں ان کو استعمال کرنے کے لئے دیدیا کرتے۔ مگر وہ بالکل چکنا گھڑا تھے۔ ان پر اختر کے اس سلوک کا کبھی کچھ اثر نہ ہوتا۔ اور پھر جب وہ کھانے پر بیٹھتے تو اختر کو بہت کوفت ہوتی۔ وہ کھانے پر اس طرح گرتے جیسے کئی دن سے بھوکے ہوں۔ اختر ان کو بتانے کی کوشش کیا کرتا مگر ان معاملات میں وہ ہمیشہ ناسمجھ ہی بنے رہے۔ اور اب ان کا وجود کم از کم اختر کے کمرے میں اختر کے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ مگر پھر بھی وہ ان کی پارٹنر شپ کا بار اپنے نحیف کاندھوں پر اٹھائے ہوئے تھا۔

البتہ اس کے دوسرے پارٹنر ماجد تھے۔ ادب اور شعر سے مس رکھنے والے ہوسٹل میں ایک سال گزارنے کی وجہ سے ان میں سوسائٹی کا شعور پیدا ہو گیا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ سوسائٹی میں کس طرح بات کرنی چاہئے۔ پڑھنے کے معاملے میں وہ بھی بڑے

حائم تھے۔ جب پڑھنے پر آتے تو کئی دن تک پڑھنے ہی کی دھن سوار رہتی۔ مگر ان میں یہ عادت بہت اچھی تھی کہ وہ زبردستی کبھی پڑھنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ جب پڑھنے کی طرف طبیعت مائل نہ ہوتی تو کئی کئی دن تک نہیں پڑھتے۔ ویسے ادب اور شعر کے معاملہ میں ان کا مطالعہ وسیع نہ تھا۔ وہ چار چوٹی کے لکھنے والوں کی انھوں نے ایک آدھ کتاب پڑھ رکھی تھی۔ اور اسی کی بنا پر ادب پر باتیں کیا کرتے۔ مگر اختر کو ان کی یہ بات بہت پسند تھی کہ وہ اپنی اس کمی کا اعتراف کرنے سے گریز نہ کرتے تھے نظریات کے اعتبار سے وہ پکے قسم کے رجعت پسند تھے۔ ترقی پسند ادیبوں اور ادب کی نئی تحریکوں سے وہ تقریباً بے خبر تھے۔ مگر اس کے باوجود وہ اختر سے اکثر مختلف ادیبوں اور شاعروں کے متعلق رائے دریافت کرتے رہتے۔ مثلاً فلاں شاعر کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ فلاں افسانہ نگار کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ اور یہی نہیں بلکہ ادب سے ہٹ کر وہ عجیب عجیب قسم کے سوال کرتے: "اختر صاحب آپ کمیونسٹ کب سے ہو گئے؟ آپ مذہب کے خلاف کیوں آواز اٹھاتے ہیں؟" اور اختر کو ان کی تمام باتوں کے جوابات دینا پڑتے کبھی لفظوں سے، کبھی اشاروں سے اور کبھی ایک ناگوار مسکراہٹ سے۔ وہ نوجوان تھے۔ مگر جنسی تجربوں سے بالکل ناآشنا۔ ان کے خیال میں جب تک نکاح کے بعد عورت اپنی ملکیت نہ بن جائے اس وقت تک کسی جنسی تجربہ کا امکان ہی نہیں۔

وہ اپنے پارٹنر کے متعلق جانے کب تک سوچتا رہتا کہ کھڑکی سے آتے ہوئے ہوا کے ایک سرد جھونکے نے اس کے بدن میں کپکپی پیدا کر دی۔ اس نے لحاف پوری طرح اوڑھ لیا اور دوسری کروٹ بدل کر کتاب پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔

اس کی باہیں کہنیوں تک کھلی ہوئی تھیں جن پر بار بار مچھر بیٹھ کر اس کا خون چوسنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایسا کہاں کا خون ہے میرے بدن میں جو یہ مچھر میرے درپے ہیں۔ وہ سوچنے لگا، مصیبت یہ ہے کہ میرے پاس اتنے بھی تو پیسے نہیں کہ ایک مچھر دانی ہی خرید لوں۔ ہر سال سوچتا ہوں کہ ایک مچھر دانی خرید لوں مگر پیسے ہی نہیں بچتے۔ کوئی ایسی گرم قمیص نہیں جو میری باہوں کو سردی سے بچا سکے ___ اونہہ' اس نے دل میں کہا۔ میرے پاس ہے ہی کیا۔ کوئی گرم کپڑا نہیں جو مجھے سردی سے بچا سکے۔ لے دے کر یہ لحاف ہے جو جگہ جگہ سے ادھڑ چکا ہے۔ اور پھر وہ اپنے لحاف کو دیکھنے لگا۔ جو جگہ جگہ سے پھٹ چکا ہے۔ روئی کی گرمی نکل چکی تھی۔ اس نے چاہا کہ آرام سے لیٹنے کے لئے پاؤں آگے بڑھائے۔ مگر جیسے ہی اس نے ایسا کرنا چاہا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے پاؤں کسی برفستانی علاقے کی طرف بڑھ گئے ہوں۔ اس نے پاؤں سکیڑ لئے۔ اور ایک ہاتھ کو جو ہوا میں ہونے کی وجہ سے سرد پڑ گیا تھا۔ دونوں رانوں کے بیچ میں دبا لیا۔

آج شام سے ہی اس کی طبیعت خراب تھی۔ وہی معدہ کی بیماری جو چھ سال سے مستقل اس کے جسم سے جونک کی طرح لگی ہوئی تھی۔ اس نے کتنے حکیموں اور ڈاکٹروں کو دکھایا مگر آخر میں ہر معالج الو کا پٹھا ہی ثابت ہوا۔ کوئی بھی ڈاکٹر اس کے مرض کی صحیح تشخیص نہ کر پایا۔ ایک کچھ کہتا اور دوسرا کچھ اور۔ اس کا بس چلتا تو ان تمام حکیموں اور ڈاکٹروں کو جو اس کے معالج رہ چکے ہیں ایک میدان میں کھڑا کر کے مشین گن کا رخ ان کی طرف کر دے اور ہزاروں مریض ان کے سنگ دل ہاتھوں سے امان پا جائیں۔ مگر پھر خود ہی اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے ان کی دوا

کبھی پابندی اور پرہیز کے ساتھ پی ہی کب؟ آج ایک کی دوا پی تو کل دوسرے کو نبض دکھادی۔ مگر اس شہر میں آکر تو اس نے صرف ایک ہی ڈاکٹر کا علاج کیا ہے آخر ان کی دوا سے فائدہ کیوں نہیں ہوتا۔ آخر کیا اس کے لئے ان کی ڈسپنسری میں کوئی معقول دوا ہی نہیں ہے۔ وہ روز بروز کم زور اور ناتواں ہوتا چلا جارہا تھا۔ وہ بالکل دق کا مریض معلوم ہونے لگا تھا۔ اس کو کھانا ہضم ہی نہ ہوتا تھا۔ اور ہضم بھی کیا ہوتا؟ ہلکی پھلکی چپاتیاں ہوتیں تو وہ کھالیتا مگر یہاں ہوسٹل میں تو اسے موٹی موٹی، جلی بھنی خمیری روٹیاں جو عام طور سے کچی رہ جاتیں، ملا کرتیں۔ اور ان کے ساتھ میں پھیکا سا بدمزہ سالن جس پر چربی۔ بناسپتی گھی کے دو ایک تار چمکتے ہوتے۔ دال ملتی تو پھیکی۔ ترکاری ملتی تو ادھ کچی۔ مگر زندہ رہنے کے لئے اسے یہ کھانا بھی حلق سے اتارنا پڑتا۔ پانی کے گھونٹ لے لے کر وہ کسی طرح اس بدمزہ کھانے کو کھالیتا اور کھانا کھا کر جب وہ بستر پر لیٹ کر سگریٹ پیتا تو دیر تک ڈائننگ ہال کے انتظام کے متعلق سوچتا رہتا۔

اس کی طبیعت خراب ہو رہی تھی۔ اس نے کروٹ بدل لی۔ اور کتاب اس کے ہاتھوں سے چھوٹ پڑی۔ وہ کتاب کو میز پر رکھ کر سگریٹ سلگانے لگا محض اس خیال سے کہ شاید سگریٹ پی کر اس کی طبیعت کو کچھ سکون ہو۔ مگر یہ اس کا وہم تھا۔ سگریٹ کا دھواں اس کے پھیپھڑوں کو جلاتا رہا۔ جب اس کو کھانا ہضم نہ ہوتا اور اس کی طبیعت زیادہ خراب ہو جاتی تو اس کے معدہ میں "گھم گھم" کی آوازیں اس طرح گونجتیں جیسے کوئی ندی میں لگاتار بڑے بڑے پتھر لڑھکا رہا ہو۔ نہ جانے کیوں اس کے دل میں یہ خیال جاگزیں ہو گیا تھا کہ وہ اس مرض سے نجات نہ پاسکے گا۔ سوکھ سوکھ

کر وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ ہوگیا تھا۔ اس کے جسم میں صرف اس کی مغموم اور زردی مائل آنکھیں بڑے بڑے بال، ماتھے کے بل اور افسردہ سے ہونٹ اس کی زندگی کا پتہ دیتے تھے مگر وہ اب تک زندگی کے اس عظیم بار کو اٹھائے پھر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس بار کو اپنے ناتواں شانوں سے جو اس بوجھ سے دکھنے لگے تھے اتار دے۔ مگر وہ ایسا کرنے میں کبھی بھی کامیاب نہ ہو پایا۔

گھڑی نے ایک بجا دیا۔ اور وہ اپنے خیالات میں اتنا کھویا ہوا تھا کہ اس کو بارہ بجنے کی بھی خبر نہ ہوئی۔ وہ کتاب اٹھا کر پھر پڑھنے لگا۔ عصمت چغتائی کا کوئی افسانہ تھا جس میں اس نے ہمارے گھناؤنے سماج کی دھجیاں بے باکی سے اڑائی تھیں۔ سماج بھی کیا مصیبت ہے جس کو دیکھو ظالم سماج کا شکار بنا ہوا ہے، اور اس کو فوراً ہی عذرا کا وہ خط یاد آگیا جو اس کو اسی دن شام کی ڈاک سے وصول ہوا تھا اور جس میں اس نے لکھا تھا: "ڈرتی ہوں کہ کہیں آپ آگے چل کر میرا ساتھ نہ چھوڑ دیں۔ کیوں کہ سماج اور اس کے قوانین آپ ہی مردوں کے بنائے ہوئے ہیں" اور عذرا کا خیال آتے ہی اس میں زندگی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس کی رگوں میں ایک نرم کسک سی پیدا ہونے لگی اور اس نے آنکھیں بند کر لیں تاکہ عذرا کو اپنے تصور کی دنیا میں لا کر جی بھر کے دیکھے اور ایک لمحے میں اس کے گیتوں کی رانی، اس کی کہانیوں کی روح اس کے سامنے آگئی۔ ہنستی، روٹھتی، مسکراتی اور جھپتی۔ عجیب لڑکی ہے عذرا بھی، وہ سوچنے لگا پہلے میں نے اس کی طرف محبت کا ہاتھ بڑھایا تو اس نے جھٹک دیا مگر پھر خود ہی بن گئی جب اسے میں کر دل میں عذرا کی محض یاد ہی یاد رہ گئی تھی، تو وہ سر تا سر محبت کی دیوی بن گئی۔

گھڑی نے دو بجا دیئے اور اس کے خیالات کا دھاگا ٹوٹ گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ آج اس کو نیند کیوں نہیں آرہی ہے۔ آج جب کہ وہ دن کو ایک منٹ بھی نہیں سویا تو جانے کیوں نیند اس سے کوسوں دور ہے۔ اس کی آنکھوں میں جلن سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ سو جانا چاہتا تھا مگر نہ ہو پاتا تھا۔ وہ پھر کتاب میں کھو گیا کروٹیں بدلتے بدلتے اس کی پسلیاں درد کرنے لگی تھیں۔ مگر وہ کرتا بھی کیا؟ ایک کروٹ لیٹے لیٹے طبیعت جو اکتا جاتی ہے اور تکلیف بھی ہوتی ہے۔ اس نے کروٹ بدل لی۔ مگر ابھی اور کچھ بھی نہ سوچ پایا تھا کہ اس کی نظر دیوار پر ٹنگی ہوئی نرگس کی تصویر پر جا پڑی۔ کتنی اچھی ہے یہ تصویر۔ گھنے بال شانوں پر بکھرے ہوئے، نشیلی آنکھیں، خوبصورت ناک اور پتلے پتلے گلابی ہونٹ۔ اور تصویر کے ساتھ ہی اسے اپنے دوست خالدی کی یاد آگئی۔ اختر کتنی مدت سے نرگس کی اس تصویر کی تلاش میں تھا اور آخر جب اس نے خالدی سے اس کا ذکر کیا تو اس نے اپنے کمرے سے جس میں نرگس کی اسی قسم کی دو تصویریں تھیں ایک تصویر اختر کو دے دی۔ اور اس طرح اس کی مدتوں کی دلی آرزو خالدی نے پوری کر دی۔ اور وہ دیر تک خالدی کی دوستی اور خلوص کے متعلق سوچتا رہا۔ خالدی کتنا وسیع القلب انسان ہے۔ وہ ذات پات اور خاندانی رسم و رواج کے خلاف۔ وہ اپنے انفرادی خیالات کو لئے ہوئے اپنی جگہ پر ایک مستحکم چٹان کے مانند کھڑا ہے۔

گھڑی نے تین بجا دیئے "اف" اختر کی زبان سے نکلا اور وہ سوچنے لگا کہ کیا آج کی رات یوں ہی آنکھوں میں کٹ جائے گی۔ نیند کب آئے گی؟ وہ اپنے دل سے اس طرح سوالات کر رہا تھا گویا نیند اس کے قبضے ہی میں ہو۔ اس

نے لحاف منہ تک تان لیا۔ مگر فوراً ہی لحاف میں اس کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے منہ کھول دیا۔ نیند اب بھی اس سے کوسوں دور تھی۔ اس نے پھر دہی افسانوں کی کتاب اٹھا لی کہ شاید پڑھتے پڑھتے اسے نیند آجائے۔

کسی افسانے میں بھکاری کا ذکر تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ وہ بھی تو ایک بھکاری ہے بلکہ بھکاری سے بھی بدتر۔ بھکاری دن بھر مانگنے اور آوارہ گردی کرنے کے بعد اپنا پیٹ تو بھر لیتا ہے۔ شام کے وقت اس کی جھولی میں چند چمکتے ہوئے سکے تو ہوتے ہیں۔ مگر اس کی تو ہر طرف سے مصیبت تھی۔ تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے اسے اپنی پوزیشن کا بھی تو لحاظ کرنا پڑتا تھا۔ سب سے زیادہ مصیبت تو اسی متوسط طبقے کی ہے۔ جس کو اپنی عزت اور غیرت قائم رکھنے کے لئے ہر طرح کا ذہنی انتشار اور کرب برداشت کرنا پڑتا ہے۔ محض اس لئے کہ سوسائٹی اسے حقارت سے نہ دیکھے اور سوسائٹی کا یہی نظام اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ وہ آزادی سے رہنا چاہتا تھا مگر آزادی میسر نہ تھی۔ قدم قدم پر بندشیں اور بات بات پر پرسشیں اور وہ سوسائٹی کے نظام کو اپنے لئے بار محسوس کرنے لگا تھا۔

دنیا کے آلام برداشت کرتے کرتے وہ زندگی کی اس منزل پر آگیا تھا۔ جہاں اُسے یہ یقین ہو چلا تھا کہ بس وہ زیادہ سے زیادہ تین چار سال اور زندہ رہے گا۔ حالانکہ ابھی اس کی عمر ہی کتنی تھی وہ بالکل جوان تھا مگر اس کے خیالات اس کے تجربات اور اس کی باتیں یہ بتاتی تھیں کہ اس کے سر میں ایک بوڑھے کا دماغ ہے اور ویسے بھی وہ بوڑھا سا تھا، چلنے میں، اٹھنے میں، پڑھنے میں، غرضکہ ہر کام میں وہ کاہل تھا اور اس کے انداز بالکل بوڑھوں جیسے تھے۔ وہ اپنی موجودہ زندگی

سے بیزار تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس زندگی کے بوجھ سے آزادی میسر ہو جائے تو اچھا ہے مگر آزادی تو اس کی قسمت میں شاید لکھی ہی نہ تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس کی اس پڑھائی کا مقصد کیا ہے۔ اگر میں بی اے پاس بھی ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا تو کیا فائدہ ہو گا۔ کلرکی مل سکتی ہے مگر وہ میرے بس کی بات نہیں۔ میں مشین کا پرزہ بننا نہیں چاہتا، چاہے مجھے فاقے ہی کیوں نہ کرنا پڑیں۔ اسکول کی ماسٹری مجھ سے ہو نہیں سکتی۔ کیونکہ جو میرے اختیاری مضامین ہیں ان سب ہی میں بالکل کورا ہوں فارسی میں افعال تک غلط ہو جاتے ہیں اور انگریزی کا تو ایک جملہ بھی صحیح نہیں بول سکتا۔ اور جغرافیہ سے تو اتنا بیگانہ ہوں کہ مجھے اچھی طرح ہندوستان کا نقشہ بھی یاد نہیں رہا ہے۔ پھر کیا کروں۔ میں بی اے کر کے کیا کروں، وہ بار بار اپنے دل سے یہی سوال کر رہا تھا۔ مگر دل نے کوئی جواب نہیں دیا۔

گھڑی نے چار بجا دیئے۔ اور اب تک وہ بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ اس نے پھر کوشش کی کہ شاید نیند آ جائے مگر ناکام رہا۔ اور اس کے افکار کے بادل اسی طرح اس کے دماغ پر چاروں طرف سے چھائے رہے۔ کاش میرے والدین بھی خوش حال ہوتے: اور میں کم از کم مالی مشکلات کا شکار نہ ہوتا۔ وہ سوچنے لگا، آج اسی ذہنی اذیت اور کرب کی وجہ سے میں مستقل جاگ رہا ہوں۔ مجھے نیند نہیں آتی ہے۔ میرا مستقبل شروع سے آخر تک تاریک نظر آتا ہے جس میں روشنی کی ایک بھی کرن نہیں جگمگاتی ۔۔۔ آخر پھر میں کیوں جی رہا ہوں؟ کس توقع پر یہ سانسیں چل رہی ہیں؟ اپنے دکھتے شانوں پر رنج و آلام کے بوجھ کب تک اٹھائے رہوں؟ اس نے بار بار خود سے سوال کئے اور میز پر رکھی ہوئی "ٹنکچر آیوڈین" کی شیشی کو حسرت بھری

نظروں سے دیکھنے لگا۔ اور کئی منٹ تک دیکھتا رہا۔

صرف ایک لمحہ میں میری تمام مصیبتوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے، اختر سوچنے لگا۔ بس اس کی تمام اذیتیں مٹ سکتی ہیں۔ نہ ذہنی کش مکش، نہ اپنی بے مائگی کا احساس۔ نہ اپنی بیماری سے نجات حاصل کرنے کی فکر اور نہ مستقبل کی تلاش۔ مگر اس خودکشی کا انجام اس کے لئے سہانا مگر دوسروں کے واسطے بھیانک تھا۔ وہ اپنے والدین کا اکلوتا لڑکا تھا۔ انھوں نے کتنے مصائب برداشت کر کے اس کو گھر سے بہت دور پڑھنے بھیجا تھا اور ان کے مستقبل کے کتنے سنہرے خواب اختر کی کامیابی پر منحصر تھے اور پھر عذرا کا خیال اس کے دماغ پر چھانے لگا۔ عذرا کو اس سے کتنی محبت تھی۔ وہ ایک بڑے گھرانے کی لڑکی پڑھی لکھی اور خوبصورت وخوب سیرت اس کی شادی کے کتنے ہی پیغام آچکے تھے مگر اس نے ایک "نہیں" میں سب کو مسترد کر دیا۔ وہ اختر کو چاہتی تھی۔ اور اختر بھی اس کی خوشی کی خاطر اپنی زندگی کی ٹوٹی پھوٹی گاڑی کو گھسیٹ رہا تھا۔

گھڑی نے آخرکار پانچ بھی بجا دیئے اور اس کے خیالات کا تار نہ ٹوٹا نیند ابھی اس سے ہزاروں کوس دور تھی۔ مگر اب تو اس کی نیند کی خواہش بھی نہ تھی۔

خودکشی تو واقعی بزدلی ہے۔ اس نے آخری بار فیصلہ کے طور پر سوچا اور دو ہاتھ جو چند منٹ پہلے زہر کی شیشی کی طرف بڑھنے والا تھا خود بخود لحاف میں منجمد سا ہو گیا وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اس کو زندگی کا دو بدو مقابلہ کرنا چاہئے۔ اس میں اس قدر احساس پستی و کمتری کیوں ہے۔ کیا اس کے ہاتھوں میں قوت نہیں۔؟ کیا اس کے قلم میں طاقت نہیں۔؟ کیا اس کے دماغ میں تدبیر سوچنے کی صلاحیت نہیں؟

ہے اور ضرور ہے۔ وہ مجبور سہی۔ محبوس سہی۔ مگر کیا غلاموں نے آزادی حاصل نہیں کی؟ کیا وہ زندگی کی موجودہ راہوں کو بدل نہیں سکتا؟ کیا اس میں موجودہ نظام کے پرخچے اڑانے کی ہمت نہیں۔؟ کیا اُس میں تقدیر کی کارسازیوں پر زہر خند کرنے کی جرأت نہیں؟ کیا یہ سب اس کے لئے ممکن نہیں ہے؟

"ممکن ہے اور ضرور ہے" جیسے کسی غیبی قوت نے اس کے کان میں کہہ دیا ہو۔ اور پھر اُسے اپنے دکھتے شانوں کا بوجھ ہلکا معلوم ہونے لگا۔ وہ ایک نئے نظام کے خواب دیکھ رہا تھا۔ نیا ماحول، نیا سماج، نئے اصول اور ایک بالکل نئی زندگی۔

گھڑی نے چھ بجا دیئے۔ آج ساری رات اس کو جاگتے گذر گئی تھی۔ مگر اس کے باوجود اب اس کا دماغ ہلکا تھا۔ آج اس کے سر سے تفکرات کا بار اُتر گیا تھا تفکرات! جو ہر وقت اس کا گلا دبوچے رہتے تھے۔ جنھوں نے اس کو موت سے قریب تر کر دیا تھا، اور آج اس نے ان تفکرات اور ذہنی پریشانیوں کی فولادی زنجیر کو ایک ہی جھٹکے میں توڑ دیا تھا۔

اس نے ایک آخری کروٹ بدل کر بستر چھوڑ دیا ـــــ اور کمرے کی کھڑکی کھول کر باہر کی کہر آلود فضاؤں میں نئی زندگی کے نئے سورج کی پہلی کرن تلاش کرنے لگا ـــــ اس کے دکھتے شانوں سے اس کی فریب خوردہ اور غمگین زندگی کا بار اتر گیا تھا اور وہ بالکل ایک نئے انسان کے روپ میں خود کو دیکھ رہا تھا۔ رات کا مضمحل چاند اور افسردہ تارے بے نور ہو چلے تھے اور وہ زندگی کے نئے افق کی پیشانی پر نظر یں جمائے کھڑا تھا۔

شعلوں کے ساتھ

شعلوں کے ساتھ

"ایک ہی بات ہے" میں نے اس کو قائل کرتے ہوئے کہا "جیسے عبد اپنے وہاں کی ویسے ہی میرے وہاں۔ وہ بھی تمھارا ہی گھر ہے"

"ہاں ہے تو مگر ... " ثریا کچھ کہہ نہ سکی

"ہاں ہاں چلی کیوں نہیں جاتیں" چچی نے میری وکالت کرتے ہوئے کہا۔ "اتنی دیر سے بھائی کہہ رہا ہے اور تم انکار ہی کئے جاتی ہو"

اور آخر کار ثریا کو میرے ساتھ میرے گھر چلنے پر رضامند ہونا ہی پڑا۔ آج آخری روزہ تھا۔ کل عید ہونیوالی تھی۔ ثریا میری چچازاد بہن تھی اور لکھنؤ میں ایف۔اے میں پڑھتی تھی۔ میں دہلی میں ایم۔اے فائنل میں تھا۔ عید کی تعطیلات میں ہم دونوں اپنے وطن آئے ہوئے تھے۔ چچی کا مکان میرے مکان سے کوئی دو فرلانگ دور تھا،

شام کو روزہ ہم سب نے ساتھ کھولا اور چھت پر چاند دیکھنے چڑھ گئے۔ چاند مجھے پہلے نظر آگیا میں نے چچی کو دکھایا اور اس کے بعد چچی نیچے چلی گئیں۔

"کہاں ہے چاند؟ مجھے بھی دکھایئے!!" ثریا نے بڑے پیارے انداز سے کہا

"میں کیوں دکھاؤں؟ خود ڈھونڈ لو۔ میں تو جاتا ہوں" ۔ میں نے کہا اور چلنے کے لئے یونہی سا ارادہ کیا۔

"آپ کو میری قسم نہ جایئے۔ میں بھی دیکھ لوں پھر ساتھ چلئے گا" اس نے کہا اور پھر چاند دیکھنے لگی۔ میں دیوار کی منڈیر پر بیٹھ گیا اور سگریٹ سلگا کر اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ چاند دیکھ رہی تھی اور میں اُسے دیکھ رہا تھا۔

"اللہ بھائی جان!! مجھے چاند نظر نہیں آتا" اس نے عجیب حسرت بھری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جیسے اگر وہ چاند نہ دیکھے گی تو عید نہ ہوگی۔ "دکھا دیجیے میرے بھائی جان!!" اندھیرا بڑھ رہا تھا اور ممکن تھا کہ کچھ دیر بعد چاند غائب ہو جاتا میں نے چاہا کہ اسے چاند دکھا دوں۔ میں اس کے قریب آیا اور چپکے سے اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔

"اگر میں چاند دکھا دوں تو کیا دو گی؟" میں نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"میں؟" اس نے سوالیہ انداز سے پوچھا۔ "اچھا جو آپ مانگیں"

اور میں نے اسے بتایا کہ نیم کے آگے جو ببول کا درخت ہے، اس کے بالکل اوپر چاند ہے۔ وہ چاند کو ڈھونڈ رہی تھی اور میرے ہاتھ اس کے شانوں کو آہستہ آہستہ دبا رہے تھے۔

"دکھائی دے گیا" اس نے انبساط کے لہجے میں زور سے کہا

"تو اب میری شرط پوری کرو" میں نے اس سے کہا

"کیسی شرط؟" اس نے پوچھا

"اچھا اب یوں مکر جاؤ گی؟" میں نے کہا۔ "خیر پھر کبھی سہی"

"تو آپ خفا ہو گئے؟" اس نے مجھے مناتے ہوئے کہا۔ "اچھا مانگئے آپ کیا مانگ رہے ہیں۔" اندھیرا بڑھ چکا تھا۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑا کر دیکھا۔ لوگ اپنی اپنی چھتوں سے چاند دیکھ کر اتر چکے تھے۔ ہر طرف خاموشی، تنہائی اور ایک مدہوشی سی فضا پر مسلط تھی۔ اور دور دھندلکوں میں چاند ابھی تک مسکرا رہا تھا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھوں کے بیچ میں اس کا گلاب سا کھلا ہوا ملائم اور گندمی چہرہ لے لیا۔

"مانگوں؟" میں نے پھر سوال کیا

"ہوں!" اس نے کہا

اور میں نے چپکے سے اس کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے اس کے سرخ جلتے ہوئے لبوں کو چوم لیا۔

"ہائے" اس نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ "آپ بڑے خراب ہیں۔"

"تو میں نے کب کہا تھا کہ میں اچھا ہوں" میں نے جواباً کہا

"میں آپ سے نہیں بولتی" اس نے کہا اور منہ پھیر کر چاند کی طرف دیکھنے لگی۔ میں نیچے اتر آیا۔

"اب تک وہ چاند نہیں دیکھ چکیں؟" چچی جان سے سوال کیا

"ابھی دیکھ رہی ہیں" میں نے کہا اور پاندان سے الائچی نکال کر کھانے لگا

—— اندھیری رات تھی اور یوں بھی چھوٹے شہروں میں شام ہی سے سناٹا چھا جاتا ہے۔ اتفاق سے ہمارے شہر میں ابھی بجلی بھی نہ لگی تھی اور میونسپلٹی کی نصب کردہ لالٹینیں اندھی پڑی تھیں۔

"لاؤ یہ کپڑے میں پکڑ لوں" میں نے ثریا سے کہا

"واہ" اس نے کہا "کیا میں تھک جاؤں گی"

"ہاں تم تھک جاؤ گی" میں نے کہا اور اس کے ہاتھوں سے کپڑے لینے لگا۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ سے مس ہوا اور اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور —— اور پھر کبھی آہستہ اور کبھی زور سے دبانے لگی —— میں کوئی مزاحمت نہ کر سکا میرے لئے وہ ایک معمہ تھی۔ وہ اکثر تنہائیوں میں یہی کرتی۔ کبھی میرا ہاتھ دبانے لگتی اور کبھی میرے گال چھو لیتی۔ مجھے اس کے معصوم جذبات میں بڑا الھڑ پن نظر آتا۔ اور میں ہمت کرنے کے باوجود نہ کبھی اس کا ہاتھ جھٹک سکا اور نہ کبھی اس کی سستی جذباتیت سے اس کو باز رکھ سکا۔ آج بھی جب اس نے میرا ہاتھ دبانا شروع کیا تو میں مجبور ہو کر رک گیا مگر اتنے میں کسی کے پاؤں کی چاپ ملی۔ کوئی راہی جا رہا تھا۔ ہم دونوں پھر روانہ ہو گئے چند منٹ میں میرا مکان آ گیا۔

رات کو کھانے سے فارغ ہو کر جب سب لیٹے تو میں نے دیکھا کہ ثریا کی اور میری چارپائی کے بیچ میں ایک اور چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ یہ میرے چھوٹے بھائی کی چارپائی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ بھائی کو اپنی چارپائی پر لٹا کر خود ثریا کے قریب والی چارپائی پر جا لیٹوں۔ مگر پھر یہ سوچ کر کہ گھر والے کیا سوچیں گے میں کچھ نہ کر سکا۔ اور اتنی قربت کو غنیمت جان کر لیٹ رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ ثریا گھر والوں کے خیال سے کسی نہ کسی بہانے

سے اٹھتی اور پھر مجھے جاگتا پا کر لیٹ جاتی ہے۔ میں نے بھی اس کی طرف کروٹ لے لی۔ سب سونے لگے تھے ــــ کوئی کسی سے باتیں نہیں کر رہا تھا دوسرے دن عید تھی۔ سب آنے والی صبح کے خوش آیند تصور میں غنودہ تھے اور میں اپنی رات کی عید کے خیال میں سرشار تھا ــــ یہاں تک کہ تھوڑی دیر بعد سب سو گئے۔ ثریا نے اپنے تکیہ کو دہرا کر لیا تاکہ وہ آسانی سے مجھے دیکھ سکے اور یہی عمل میں نے بھی کیا۔ اب ہم دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے لیٹے تھے۔ گھر والے ہمارے اس راز و نیاز سے بے خبر تھے جو ہم دونوں کی آنکھوں آنکھوں میں ہو رہا تھا۔ ہم دونوں کی زبانیں گھر والوں کے ڈر سے ساکت تھیں مگر آنکھیں زبان کا کام کر رہی تھیں۔ تھوڑی دیر میں لیمپ بجھانے کے لئے اٹھا اور مجھے ثریا کے سرہانے سے ہو کر گذرنا پڑا۔ میں نے دیکھا کہ وہ مجھے دیکھنے کی کوشش کر رہی ہے اور جب میں واپس ہوا تو دیکھا کہ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف پھیلے ہوئے تھے۔ جیسے کہ نیند میں اس کے ہاتھ خود بخود پیچھے کی طرف چارپائی سے لٹک گئے ہوں۔ عین اس وقت جب میں اس کے سرہانے سے گذر رہا تھا اس کے ملائم ہاتھوں نے میرے بدن کو چھوا۔ جوابًا میں نے اس کی شانوں تک کھلی ہوئی ملائم اور گداز باہوں کو آہستہ سے دبا دیا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے میرے ہاتھ پکڑ لئے۔ رگ رگ میں بجلی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ میں بے خودی میں اس کے منہ کی طرف جھکا مگر معًا مجھے خیال آیا کہ کہیں کوئی جاگ نہ جائے اس لئے میں اپنی چارپائی پر آ کر لیٹ گیا اور پھر اسی خاموشی سے آنکھوں آنکھوں میں باتیں ہونے لگیں۔ بڑی دیر تک ہم لوگ یونہی لیٹے جاگتے رہے۔ اندھیرا ہو جانے کے باعث ہم دونوں ایک دوسرے کو واضح طور پر نہ دیکھ سکتے تھے۔ مگر پھر بھی کھانسنے کی آواز

"ارے ثریا!!" چچی جان نے پکارا

"آئی امی!" ثریا نے چھت پر سے جواب دیا

اور جب وہ اتر کر نیچے آئی تو میں چلنے کے لئے کھڑا ہوا

"کھانا کھا لیجئے دو اسے" چچی نے مجھے روکتے ہوئے کہا

"کیا میرے گھر میں کھانا نہیں مل سکتا" میں نے جواباً کہا

"نہیں! میں یہ کب کہتی ہوں - خدا نہ کرے" وہ بولیں "اور ہاں میری

خاطر ذرا سا تم بھی کھا لو"

"یہ بھلا یہاں کیوں کھانے لگے" ثریا نے طنز کیا "ہم غریب آدمی جو

ٹھہرے"

"ہم کب امیر ہیں؟" میں نے کہا "اگر آپ لوگوں کی خوشی ہے تو لائیے"

اور پھر میں نے ایسا محسوس کیا جیسے چچی کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا - اور

چچی سے زیادہ ثریا خوش نظر آ رہی تھی ——— دوڑ دوڑ کر وہ بار بار کوئی نئی چیز لاتی - کھانے

پر بیٹھنے کے بعد بھی اس کا دماغ جیسے یہی سوچ رہا ہو کہ اور کون چیز کھانے پر جلدی اور

آسانی سے مہیا ہو سکتی ہے - یہاں تک کہ کھانے پر اچھی خاصی دعوت کا سامان نظر

آنے لگا - اور اسی چکر میں رات زیادہ ہو گئی ———

"اب جلدی چلو ثریا" میں نے کہا "گھر میں میرا انتظار ہو رہا ہو گا"

"کل کے لئے کپڑے تو لے لوں" اس نے کہا اور پھر اندر کمرے میں

چلی گئی ———

دس بجے تک کہیں جا کر وہ تیار ہو پائی اور پھر ہم دونوں روانہ ہوئے

سے، ہاتھوں کی حرکت سے اور ہر ممکن طریقہ سے ہم ایک دوسرے کو یہ بتا رہے تھے کہ ہم جاگ رہے ہیں۔

مگر اسی عالم میں نجانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ پتہ نہیں ثریا کب تک جاگتی رہی۔ میں سو گیا صبح کو گھر میں سب سے پہلے میری آنکھ کھلی۔ میں اٹھا تو دیکھا کہ ثریا کا دوپٹہ اس کے سرھانے رکھا ہے اور اس کے لانبے اور ملائم بال پورے تکیہ پر بکھرے پڑے ہیں۔ بالوں کی ایک ریشمی لٹ اس کی مرمریں گردن کا ہالا کئے ہوئے تھی۔ اور صبح کی ہلکی ہلکی روشنی میں اس کا نیلا باریک جمپر اس کے ابھرے ہوئے شفاف سینے کو نمایاں کر رہا تھا۔ نرگسی پپوٹوں کا خوابیدہ جادو اپنے اندر وہ کشش رکھتا تھا کہ میں چند لمحوں تک اس کی چارپائی کے پاس کھڑا اس کو تکتا رہا مگر پھر مجھے خیال آیا کہ کہیں مجھے اس طرح ثریا کو تکتے ہوئے کوئی دیکھ نہ لے اور یہ سوچ کر میں وہاں سے ہٹ آیا۔

میرا مردانہ مکان زنانہ سے ملحق تھا مگر وہ بیشتر خالی رہتا تھا۔ البتہ جب تک میں تعطیلات میں گھر پر رہتا وہ آباد رہتا۔ ان عید کی چھٹیوں میں بھی میری ضروریات کا سارا سامان وہیں منتقل تھا۔ زنانہ اور مردانہ مکان کے بیچ میں کوئی دروازہ نہ تھا بلکہ دونوں مکانوں میں زینے بنے تھے جن کے ذریعہ اِدھر اُدھر آنا جانا ہوتا تھا۔

عید کی نماز کے بعد میں اپنے مردانہ مکان میں لیٹا تھا۔ عجیب بات تھی کہ پورے شہر میں میرا کوئی دوست نہ تھا جو اس وقت میرے پاس ہوتا۔ علاوہ اس کے کہ میں تنہا لیٹے لیٹے کتابیں پڑھا کروں۔ سگریٹ پیا کروں اور سوچا کروں۔ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ میں لیٹا تھا کہ اتنے میں چھت پر کسی کے پاؤں کی چاپ معلوم ہوئی میں سمجھا کہ والدہ ہوں گی۔ اس لئے میں نے تعظیماً سگریٹ بجھا دی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

مگر میں نے دیکھا کہ ثریا صاحبہ تشریف لا رہی ہیں۔ ہلکے ہلکے ارغوانی رنگ کا دوپٹہ ان کے شانوں پر پڑا ہوا تھا اور گلابی جمپر اس کے گلابی بدن پر بڑا حسین معلوم ہو رہا تھا۔ ریشمی پاجامہ پر حسین پھول بنے ہوئے تھے۔

"آیئے! آیئے" میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا "آپ سے عید ملنی ہے"

"میں عید نہیں ملتی" وہ اس انداز سے بولی جیسے بہت ناراض ہو۔

"کچھ خفا ہو؟" میں نے پوچھا

"جی ہاں" اس نے کہا اور میری چارپائی پر سے "روپ" اٹھا کر دیکھنے لگی۔

"کیوں خفا ہو؟" میں نے پوچھا اور اس کے ہاتھ سے کتاب چھین لی۔

"میں کتنی رات تک جاگتی رہی اور آپ ... " آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔

"ہاں واقعی مجھے اس کا افسوس ہے" میں نے کہا "کیوں کہ میں دن میں کام کاج کی وجہ سے بہت تھک گیا تھا لہذا نیند جلد آگئی"

"تو خیر معاف کر دیا" اس نے کہا اور اتنی دیر بعد مسہری پر بیٹھنے کی تکلیف کی۔

"اب تو عید مل لو" میں نے کہا

"اونہوں" اس نے اس انداز سے اقرار کیا جس میں سینکڑوں اقرار پوشیدہ تھے اور جب میں اس سے عید ملنے بڑھا تو اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ خود کو میرے سپرد کر دیا۔ اور بھینچ بھینچ کر پیار کرنے لگی اور پھر میں نے اُسے چھوڑ دیا۔

میں پلنگ پر لیٹ کر سگریٹ پینے لگا اور وہ "روپ" دیکھنے لگی۔

؎ مجموعہ رباعیات حضرت فراق گورکھپوری

"عیدی نہیں دیجیے گا" اس نے پڑھتے پڑھتے چونک کر کہا
"بھلا میں تمھیں عیدی کیا دے سکتا ہوں" میں نے کہا "سوائے اس کے کہ تمھیں پیار کر لوں"

"آپ بہت خراب ہیں" اس نے بڑے انداز سے کہا
"اس میں تو کوئی شک نہیں" میں نے صرف کہا اور پھر سگریٹ کے دھوئیں سے کمرے کی فضا کو معطر کرنے لگا۔ وہ کتاب میں کھو گئی۔
"ایک بات کہوں مانو گی؟" میں نے کہا
"وہ کیا؟" اس نے سوالیہ انداز سے دیکھتے ہوئے پوچھا
"ایک گیت سنا دو گی؟"
"جی نہیں!"
"پھر مجھے زبردستی کرنی پڑے گی"
"اچھا پہلے آپ"
"واہ میں کیا جانوں گانا؟"
"آپ اپنی کوئی نظم سنا دیجیے"
"اچھا سنو!" میں نے جھگڑا مٹاتے ہوئے کہا "مگر اس کے بعد تم کو گیت سنانا لازمی ہے"

"اچھی بات" اس نے کہا اور نظریں نیچی کر کے بیٹھ گئی
میں نے اس کو ایک چھوٹی سی نظم سنائی اور پھر گیت سنانے کی فرمائش کی مگر اس نے ٹالنا چاہا۔

"میں اب نہیں سناتی" اس نے کہا اور میں نے اس انکار کی سزا کے طور پر اس کے چٹکی لے لی۔

"اُفوہ!" اس نے کہا "آپ تو خواہ مخواہ پریشان کرتے ہیں"

"تو پھر سنا دو جلدی سے" میں بولا

"اچھا سنئے" وہ بولی "مگر مجھے آپ کے سامنے شرم لگتی ہے۔ آپ ایک طرف ہو جائیے"

اور چونکہ مجھے گیت سننا تھا۔ لہٰذا میں کمرے سے نکل کر برآمدے میں ایسی جگہ کھڑا ہو گیا جہاں سے وہ مجھے نہ دیکھ سکے۔ مگر ثریا کو گیت سنانا ہی نہ تھا۔ اس کے دماغ میں ایک نئی شرارت کروٹیں لے رہی تھی۔ جب میں برآمدہ میں پہنچ گیا تو وہ بھاگ کر زینے میں ہو رہی تاکہ زنانہ مکان میں چلی جائے اور گیت سنانے سے بچ جائے مگر میں نے اس کو بھاگتے ہوئے دیکھ لیا اور اس کے پیچھے دوڑ کر اس کو زینہ میں جا لیا اب وہ میری گرفت میں تھی، وہ میرے بازوؤں میں بے دم تھی۔ اس کے مہکتے ہوئے پیرہن کی سرسراہٹیں، اس کی گرم گرم عطر بیز سانسیں۔ اس کے جذبات کی غمازی کر رہی تھیں۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس کا سانس تیز ہو گیا تھا اس نے خود کو بالکل میرے سپرد کر دیا تھا۔ میں اسے بازوؤں میں لئے ہوئے اپنے کمرے میں آ گیا۔

"اب گیت سناؤ!"

"گیت!" اس نے آہستہ سے کہا اور چپ ہو گئی۔ جیسے گیت کوئی معمہ ہو جیسے ایک لفظ گیت میں ہزاروں بھید پنہاں ہوں۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری

طرف دیکھنے لگی جیسے میں کوئی عجیب و غریب قسم کا مطالبہ کر رہا ہوں جو اس کے لئے ناممکن تھا۔ اس کا سانس، اور تیز ہو چکا تھا۔ بدن میں تھرتھراہٹ سی تھی۔ میری سمجھ میں یہ آیا کہ میرے سامنے اس کی یہ کیا کیفیت ہو جاتی ہے۔

"گیت!" اس نے پھر کہا۔ اس کی آواز میں بڑی نرمی تھی "گیت واقعی میں آپ کے سامنے نہیں سنا سکتی"

"کیوں؟" میں نے پوچھا

"آپ کے سامنے مجھے نہ جانے کیا ہو جاتا ہے" ۔ وہ بولی "آپ ہٹ جائیں تو سنا دوں"

"اب کے تو نہ بھاگو گی؟" میں نے پوچھا

"نہیں" اس نے کہا اور میں ایک بار پھر برآمدے میں چلا گیا۔ اس نے گیت شروع کر دیا۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ اور چند لمحوں بعد گیت ختم ہو گیا۔

"ایک گیت اور" میں نے فرمائش کی اور اس نے بغیر انکار کئے تعمیل کی۔ وہ گیت سنا رہی تھی اور میں گیت سے زیادہ اس کی شخصیت کے متعلق سوچنے میں گم تھا۔ اس کی ذات میرے لئے دن بدن معمہ بنتی جا رہی تھی۔ میں نے جب اس سے کوئی بات کہی اس نے انکار نہ کیا۔ ثریا کا سامنا کرتے وقت مجھے جیسے پسینہ سا آنے لگتا۔ میں سوچنے لگا کہ ثریا کو مجھ سے محبت ہے۔ وہ بارہا اس کا اظہار کر چکی ہے۔ مگر میں کیا کروں۔ اس کی طرف سے میرے دل میں محبت کی کشش اب تک بیدار نہیں ہوئی۔ میرے خیالوں پر نجمہ چھائی ہوئی تھی۔ جسے ثریا بھی جانتی تھی۔ مگر جب ثریا مجھ سے کہتی کہ "مجھے آپ سے محبت ہے" تو مجھے بھی یہی کہنا پڑتا کہ "اور مجھے

بھی تم سے محبت ہے"، مگر جب میں اس سے یہ کہتا تو مجھے اپنا نفس ملامت کرتا ہوا معلوم ہوتا۔ میرے الفاظ کا کھوکھلاپن میرا منہ چڑاتا۔ مگر اس کے باوجود میں ثریا کی محبت کا جواب نفی میں دے کر اس کے تصور کے رنگ محلوں کو منہدم نہیں کرنا چاہتا تھا
اس کا گیت کب کا ختم ہو چکا تھا، مگر میں اب سوچتا ہی چلا جا رہا تھا۔

"آپ کدھر چلے گئے؟" اس نے کمرے ہی میں بیٹھے بیٹھے پوچھا اور میری سوچ کے تار بکھر گئے۔

"دونوں گیت بہت پیارے تھے" میں نے اندر آتے ہوئے کہا "تمہاری آواز میں کتنا سوز، کتنا درد، کتنی نغمگی اور لچک ہے ——— میں تو بالکل ان گیتوں میں خود کو کھو بیٹھا"

"بس رہنے دیجئے!" وہ بولی "اب آپ لگے بنانے"

وہ سنبھل کر کچھ اس انداز سے بیٹھنے لگی کہ مجھے یہ غلط فہمی ہوئی کہ وہ جا رہی ہے

"پھر کب آؤ گی" میں نے پوچھا

"کبھی نہیں" اس نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "جب آپ ابھی سے بھگا رہے ہیں تو پھر کیوں آؤں گی۔ کیا مجھے کتے نے کاٹا ہے"

"کتے نے نہیں تمھیں آدمی نے کاٹا ہے" میں نے کہا "تم شوق سے بیٹھو مجھے یہ خیال ہوا کہ تم شاید جا رہی ہو"

اور وہ چپ ہو گئی۔ کچھ نہ بولی مگر عجیب نظروں سے مجھے دیکھتی رہی

"ہاں یہ بتاؤ کہ مردانے میں آتے وقت تم گھر میں کیا کہہ کر آئی تھیں؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"میں نے چچی جان سے کہا کہ میں ذرا بھائی جان کی کتابیں دیکھنے جا رہی ہوں"

وہ بولی۔

"اچھا!" میں نے کہا:" اور انھوں نے تم کو اجازت دے دی"

"جی ہاں!" اس نے کہا "چچی جان کا خیال تھا کہ آپ مردانے میں نہیں ہیں مگر میں آپ کو اس طرف آتے ہوئے دیکھ چکی تھی"

"مگر اب کافی دیر ہو گئی ہے، وہ تمھارا انتظار کرتی ہوں گی" میں نے کہا

"میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ آپ مجھے بھگانا چاہتے ہیں" وہ بولی "بس بہانے ڈھونڈ رہے ہیں"

"نہیں میں تو تمھارے ہی خیال سے کہہ رہا تھا" میں نے کہا

"اچھا اب میں جاتی ہوں" وہ بولی اور اٹھ کر چلنے لگی۔

"پھر کب آؤ گی؟" میں نے خواہ مخواہ پوچھ لیا

"تقریباً ۱۲ بجے" اس نے جواب دیا اور چلی گئی۔ میں نے دیکھا گھڑی میں ابھی ساڑھے دس بجے تھے۔ ڈیڑھ گھنٹہ اطمینان سے میں پڑھ سکتا تھا۔ نجانے کیوں ثریا کے محبت کرنے کے باوجود میں اس کے سامنے آتے ہوئے جھجکتا تھا۔ میں جب اس سے تنہائی میں ملتا تو اپنے ضمیر کو دھوکا دے کر اس کے نوجوان جذبات کا ساتھ دینے پر مجبور ہو جاتا۔ اور پھر جب میں بالکل اکیلا ہوتا تو انھی باتوں پر غصہ آتا۔ ندامت محسوس ہوتی۔

کتاب پڑھتے پڑھتے ۱۲ بج گئے۔ میں چونکا کہ اب وہ آنے ہی والی ہو گی خطرہ قریب تھا۔ کتابیں اٹھا کر میں نے الماری میں رکھ دیں اور کروٹ لے کر لیٹ گیا کہ شاید وہ مجھے سویا ہوا سمجھ کر واپس چلی جائے۔ اتنے میں چھت پر پاؤں کی آہٹ پیدا ہوئی۔ اور

پھر یہ آہٹ تیز تر ہوتی گئی ۔ ایک لمحہ بعد وہی جانی پہچانی سرسراہٹیں میرے کمرے میں گونجنے لگیں ۔ یہ پُراسرار آہٹیں لمحہ بہ لمحہ میرے قریب ہوتی گئیں ۔

" اچھا تو آپ سو رہے ہیں ،، اس نے مجھ پر جھکتے ہوئے کہا ۔ میں نے محض آنکھیں بند کر رکھی تھیں مگر اس کے باوجود میں کچھ نہ بولا ——— اور پھر وہ مسہری پر میرے بالکل قریب ہو کر بیٹھ گئی اور لمحہ بھر بعد اس کی سانسوں میں مدوجزر پیدا ہونے لگا ۔ اس نے اپنے ملائم ہاتھ میری بانہہ پر رکھ دیئے ۔ میں اب بھی اسی طرح بنا لیٹا رہا ۔ اس نے مجھے گدگدا دیا اور مجبوراً مجھے اپنے اصلی روپ میں آنا پڑا ۔ اس نے پیش قدمی کی تھی ۔ میں کب تک انتظار کرتا اس کی بے باک امنگیں مجھے آواز دے رہی تھیں ۔ مجھے ان کی آواز پر لبیک کہنا پڑا میں نے اسے آغوش میں لے لیا ۔ وہ مع اپنے سینڈل کے مسہری پر لیٹ گئی ۔ چادر خراب ہو گئی ۔ مگر اس وقت غم کسے تھا ؟

وہ دو دلوں کا میل ، وہ دھڑکن ، وہ تیز سانس
تھی جنت خیال جدھر دیکھتا تھا میں

میں ثریا کی جوان امنگوں کے آگے بے بس تھا ۔ میں اس سے یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا ۔ اور انکار نہ کرنے سے ثریا کا یقین اور آئندہ کا تصور قوی تر ہوتا جاتا تھا ۔ وہ بہت دیر تک مجھ سے ہم آغوش رہی ۔ اس کی ریشمی زلفیں سب کی سب بکھر گئی تھیں ، کچھ سینے اور کچھ شانوں پر لہرا رہی تھیں ۔ اس کے دوپٹہ کا پتہ نہ تھا ۔ شاید پلنگ سے نیچے لٹک گیا تھا اور اس کی مدبھری آنکھوں میں حیا خمار بن چکی تھی ۔

اتنے میں کسی کے پاؤں کی چاپ معلوم ہوئی ۔ اور وہ جلدی سے ہٹ کر دوسرے پلنگ پر بیٹھ گئی ۔ اس نے جلدی جلدی بالوں کو سمیٹا اور قاعدہ سے دوپٹہ اوڑھ لیا ۔ مزید

احتیاط کے لئے اس نے الماری سے ایک کتاب نکال کر اپنے سامنے رکھ لی۔ میں بھی کسی کتاب کے ورق الٹنے لگا۔

"امی بلا رہی ہیں آپ کو ثریا باجی" میرے چھوٹے بھائی نے آ کر کہا اور ثریا چلی گئی۔ مگر مستقل طور پر وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے مڑ مڑ کر دیکھتی جاتی تھی۔ نجانے کیوں اس کے اس طرح دیکھنے سے میں کانپ جاتا ہوں۔

وہ چلی گئی اور میں پھر اپنے خیالوں میں کھو گیا۔ نجانے کتنی دیر تک میں ثریا کے متعلق سوچتا رہا۔ مجھے یاد آیا کہ ایک دن اس نے کتنے پیار سے کہا تھا کہ "بھائی جان! میں جس قدر آپ کے پاس آنے کی کوشش کرتی ہوں آپ اسی قدر دور بھاگتے ہیں"

"نہیں تو ــــ ایسا تو نہیں ہے" میں کچھ جواب نہ دے سکا۔ کیونکہ اس کی بیان میں حقیقت کی تلخی تھی۔

"میں آپ سے اس وقت سے محبت کرتی ہوں جب آپ بہت چھوٹے تھے" اس نے اپنی گفتگو کو اور طول دیا تھا۔

"اگر میں بہت چھوٹا ہوں گا تب تو تم مجھ سے بہت ہی چھوٹی ہو گی" میں نے اسے دلائل کے ذریعہ سمجھانا چاہا۔ "اس لئے محبت کا احساس پہلے مجھ میں پیدا ہونا چاہیے"

"ہاں مگر اتفاق سے یہ احساس پہلے مجھ میں پیدا ہوا" اس نے اپنی بڑائی ظاہر کی

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو" میں نے غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے کہا "تمھیں کیا معلوم کسی کے دل کا حال۔ میں تو تم کو بہت زمانے سے چاہتا ہوں"

اور جیسے سچ مچ اس کو یقین آ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں محبت کی روشنی سے جگمگا اٹھی تھیں۔ اور میں سوچنے لگا تھا کہ کہیں میری یہ غلط بیانی ثریا کی بربادی کا سبب

نہ بن جائے ۔

ایسے ہی ایک دن میں نجمہ کے پرانے خطوط دیکھ رہا تھا۔ ثریا کو خوب معلوم تھا کہ مجھے نجمہ سے محبت ہے مگر نجانے کیوں وہ خود کو نجمہ سے برتر ثابت کرنے کی کوشش کیا کرتی۔ وہ سمجھتی تھی کہ شاید نجمہ سے دور رہ کر میں اس کو پیار کرنے لگوں گا۔ ہاں تو اس نے پوچھا کہ "یہ خطوط کس کے ہیں؟" اور میں نے جواب دیا تھا کہ معلوم نہیں کس کے ہیں۔ اور پھر اتفاق سے اس کی نظر لفافے کے کونے پر پڑ گئی۔ جس پر لکھا تھا "نجمہ"

"میں بتاؤں یہ خطوط کس کے ہیں" وہ کہنے لگی

"بتاؤ" میں نے کہا تھا۔

"یہ میری بھابی نجمہ کے ہیں" اس نے کہا اور پہلے مجھے ثریا کی اس فراخ دلی پر تعجب ہوا مگر جلد ہی میں اس کے لہجے میں چھپے ہوئے طنز کو محسوس کر لیا۔ یہ جملہ تو اس نے محض تفریحاً کہہ دیا تھا۔ مگر اس کی آنکھیں پکار پکار کر کہہ رہی تھیں کہ "مجھے تم سے محبت ہے"

اور پھر اسی عید کے دن شام کو اس نے والدہ سے ذکر کیا کہ وہ اپنے گھر جانا چاہتی ہے۔ والدہ صاحبہ ثریا کی اس قدر جلد روانگی پر متعجب تھیں۔ مگر وہ جانے پر مصر تھی میں ہی اس کو پہنچانے کے لئے گیا۔ راستہ تو کچھ دور خاموشی سے گذرا، مگر پھر——

"کیا آپ امسال دہلی بغرض تعلیم پھر جائیں گے" اس نے پوچھا

میں سمجھ رہا تھا کہ اس نے یہ کیوں پوچھا۔ وہ چاہتی تھی کہ میں دہلی میں تعلیم حاصل نہ کروں۔ وہاں پہنچ کر نجمہ کی قربت یقینی ہے جو ثریا کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ میں نے محض یہ سوچ کر کہ ثریا کی دل شکنی نہ ہو کہہ دیا "امسال تو ارادہ نہیں ہے" اور میں

نے غور کیا کہ ثریا کے چہرے پر مسرت کی لہریں دوڑنے لگیں۔

"پسچ!!؟" اس نے کہا اور زور سے میرا ہاتھ دبا دیا "آپ کتنے اچھے ہیں بھائی جان"

"امسال میں سروس کا ارادہ کر رہا ہوں" میں نے اس کی جذباتیت سے الگ ہٹ کر ایک بات کہی، کیونکہ میرا نیم ارادہ سروس کا بھی تھا۔

"پھر آپ مجھے کب تک اپنائیں گے" اس نے بے باکی سے پوچھا اور میں سوچنے لگا کہ اس کی بات کا کیا جواب دوں۔

"دیکھو کب یہ ناؤ پار لگتی ہے" میں نے ایک ذو معنی سا جملہ کہا جس کا اس نے وہی مطلب لیا جو اسے لینا چاہیئے۔

"پھر نجمہ کا کیا ہوگا؟" اس نے اس پُر ملال لہجے میں پوچھا جیسے واقعی اسے نجمہ سے ہمدردی ہو۔

"میں نجومی نہیں ہوں ثریا" میں نے جواب دیا "جو سب کے مستقبل کی ضمانت کرتا پھروں۔ کون جانے کس کا کیا ہوگا؟" ——— اور اتنے میں ثریا کا مکان آگیا۔

دن کو میں عید ملنے چچی کے وہاں بھی نہ جاسکا تھا۔ اپنی کتابوں اور ثریا کی دلچسپیوں نے اتنی مہلت ہی نہ دی تھی کہ میں کہیں جاتا۔ انھوں نے شکوے شکایات شروع کر دیئے اور پھر سوئیاں کھانے پر ان کا اصرار۔ میرا انکار ان کے اصرار کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگیا۔ اور ثریا ایک پیالے میں سوئیاں لے کر آموجود ہوئی۔ اس وقت لیمپ کی روشنی مدھم تھی۔ اندھیرا سا پھیلا ہوا تھا۔ ثریا نے اپنا وہ ہاتھ جس میں پیالہ تھا میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اور کئی لمحے تک آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی رہی چچی

پان بنا رہی تھیں۔ ان کی توجہ ہماری طرف نہ تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ ثریا کس قدر جذباتی لڑکی ہے ـــــ بات بات پر پُراسرار سرسراہٹیں، لرزشیں اور جنبشیں، قدم قدم پر لغزشیں اور سازشیں۔ اور یہی سوچتے ہوئے کہ یا الٰہی اس کھیل کا انجام کیا ہوگا میں نے پیالہ خالی کر دیا۔ چچی نے پان دیا اور پھر میں ان سے باتیں کرنے لگا۔ اتنے میں ثریا صدر دروازے کی طرف جانے لگی۔ میں سمجھا کہ وہ باہری کواڑ بند کرنے جا رہی ہے اس لئے کوئی توجہ نہ دی اور چچی سے باتیں کرتا رہا۔ اور چچی یہ سمجھیں کہ پڑوس کے مکان میں گئی ہو انھوں نے بھی کوئی دھیان نہیں دیا۔ میں چچی سے دیر تک باتیں کرتا رہا۔ وہ میری آئندہ زندگی کی بہتری اور عمدہ ملازمت کے لئے دعا مانگتی رہیں۔ اور میں آئندہ آنے کے لئے کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں صدر دروازہ کی طرف آیا تو پتہ چلا کہ بر وٹھے میں بالکل تاریکی ہے۔ دو تین کوٹھریوں سے گذرنے کے بعد صدر دروازہ پڑتا تھا۔ جب میں صدر دروازے کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ دہلیز پر ثریا کھڑی تھی۔ میں نے اس کے شانوں پر دونوں ہاتھ رکھ دیئے تاکہ وہ ایک طرف کو ہٹ جائے۔ اور میں دروازے سے باہر چلا جاؤں مگر ـــــ اس نے میرے دونوں ہاتھ اپنی گرفت میں لے لئے۔

"تم یہاں کیوں کھڑی ہو؟" میں نے اس سے پوچھا

"پھر آپ سے ملاقات کہاں ہوتی" اس نے کہا۔ "وہاں تو امی تھیں"

"ثریا! تم میرا کس قدر خیال کرتی ہو" میں نے کہا اور سوچ رہا تھا کہ وہ ہاتھ چھوڑ دے تو میں چلوں مگر .... میرے ہاتھ اس کی مضبوط گرفت میں تھے۔ اس کا سانس تیز ہونے لگا تھا اور اس کا ابھرا ہوا بلوریں سینہ پھول رہا تھا۔ جوانی کی خوابیدہ لغزشیں تاریکی پا کر چمک اٹھیں۔ اس کے تھرتھراتے ہوئے جوان ہاتھوں کی گرفت

اور مضبوط ہوگئی ۔ اور پھر ایک لمحہ بعد وہ میرے بازوؤں میں تھی ۔ اس پُر اسرار تاریکی میں ثریا کی جوانی کے چراغ روشن تھے ۔ میں بھی اس کے جذبات کی شدت اور تندی کے مقابلہ میں ہار گیا تھا ۔ اور دو جوان روحیں دنیا والوں کی نظر سے چھپ کر تاریکی میں حسین گناہوں کی ٹھنڈی چھاؤں تلے جی رہی تھیں ۔ کامل پانچ چھ منٹ تک اس کے ہاتھوں کی گرفت سخت رہی اور اس کے بعد وہ جیسے بے دم ہوگئی ۔ ہاتھوں کی گرفت سست پڑ گئی ... مگر اس کا سانس اب بھی تیز تیز چل رہا تھا ۔

" بھائی جان " اس نے ایک لمبا سا سانس لیتے ہوئے کہا " مجھے اب اپنے وہاں کب بلائیے گا ؟ "

" جب تم آنے کے لئے تیار ہو جاؤ " میں نے کہا

" تو دو تین دن میں لے جائیے گا " اس نے کہا اور میں " اچھا " کہتا ہوا دروازے سے باہر نکل آیا ۔ سگریٹ سلگایا اور تیزی سے گھر کی طرف چلنے لگا ۔

بس سوچ رہا تھا ۔ میں کچھ سوچ رہا تھا ——— ہاں میں ثریا کے متعلق سوچ رہا تھا کہ آخر کب تک میں ثریا کے تند جذبات کی شوریدگی کا مقابلہ کرتا رہوں گا ۔ وہ ایک اُبلتے ہوئے لاوے کی مانند میری طرف بڑھتی آ رہی تھی اور مجھ کو مجبور کر رہی تھی کہ میں بھی اس لاوے میں بہہ چلوں ۔

کون جانے کہ کب تک ثریا کے جذبات کا یہ لاوا اُبلتا رہے گا اور اس کے شعلوں کے ساتھ مجھے بھی جلنا پڑے گا ——— ؟

۲۴ جولائی ۱۹۴۷ء

ملازمت

ملازمت

خوش قسمتی سمجھئے یا بد قسمتی، بہرحال کہنا یہ ہے کہ میں نے کئی سال پہلے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا۔ کچھ تو خوش قسمتی ہے کہ موٹی موٹی خشک کتابوں سے پیچھا چھوٹ گیا۔ اور بد قسمتی یہ کہ اب مجھے اپنے نازک دماغ پر زور دے کر یہ سوچنا پڑا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ خیر یہ تو بعد کی باتیں ہیں ——— نتیجہ دیکھ کر میں گھر کی طرف آرہا تھا۔ اور میرے ساتھ ایک اور صاحب تھے۔ جو تیسرے درجہ (تھرڈ ڈویژن) میں پاس ہونے کے باوجود بہت خوش تھے۔ مجھ کو حالانکہ پاس ہونے کی امید نہ تھی۔ مگر جب (سیکنڈ ڈویژن) دوسرے درجہ میں پاس ہوگیا۔ تو یہ افسوس ہونے لگا کہ میں اول درجہ (فرسٹ ڈویژن) میں کیوں نہ پاس ہوا۔ پرچے تو سب اچھے کئے تھے۔ اردو اور فارسی میں تو ممتاز آنیکی قوی امید تھی۔ اور دیگر مضامین میں فرسٹ کلاس نمبر کی تو امید ضرور تھی۔ حساب میں بھی ممیز آنے کا یقین تھا۔ الغرض نتیجہ دیکھ کر مجھے یہ

یقین ہو گیا کہ ممتحن اصحاب نے بے ایمانی سے کام لیا ہے ——— میں اسی فکر میں پژمردہ سا مکان میں داخل ہوا میرے دوسرے ساتھی تھرڈ ڈویژن میں پاس ہو جانے کی وجہ سے پھولے نہ سماتے تھے۔ چنانچہ جب گھر کے لوگوں نے مجھے غمگین اور اُن کو خوش پایا۔ تو سمجھے کہ میں فیل ہو گیا ہوں اور سمجھانے لگے ۔

" ارے بھئی افسوس کیوں کرتے ہو " والد صاحب بولے

" امتحانوں میں تو یہ ہوا ہی کرتا ہے "۔ والدہ صاحبہ نے صاد کیا

" یہ کاپیاں جانچنے والے بھی بڑے بے ایمان ہوتے ہیں " چھوٹی بہن نے غصے میں کہا۔

" تعجب ہے کہ اتنے اچھے پرچے کرنے کے بعد بھی فیل کر دیا " بھابی جان بولیں۔ آخری جملے پر میں چونک پڑا کون فیل ہو گیا ؟ " میں نے بھابی کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔

" تمھارے بارے میں کہا تھا " بھابی نے افسردگی سے جواب دیا۔

" نہیں تو میں تو پاس ہو گیا ہوں " میں نے شکوک رفع کرتے ہوئے کہا۔

اور فوراً فضا میں سب کے ملے جلے کلمات گونجے : پاس ہو گئے ۔ پاس ہو گئے "

" تو پھر افسوس کاہے کا " والد صاحب نے تحقیقی نظر سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

" کچھ نہیں ، سیکنڈ ڈویژن آیا ہے " میں نے مردہ دلی سے جواب دیا۔

"سیکنڈ ڈویژن! ـــــ یہ اور اچھا ہوا"، والد صاحب نے میری پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا "جاؤ عیدا سے کہو کہ دس روپے کی مٹھائی لے آئے"

اور یکایک سب غمگینی قہقہوں میں تبدیل ہو گئی۔ اور چند لمحوں میں تمام گھر قہقہوں اور مسکراہٹوں کی وجہ سے زعفران زار بن گیا ـــــ بات کی بات میں قصبہ میں خبر پھیل گئی ـــــ میں سوچنے لگا میٹرک پاس کرنا کتنی بڑی بات ہے۔ آج میرے مقابلہ کا پورے قصبہ میں کوئی تعلیم یافتہ شخص نہ تھا۔ میں جدھر سے گزرتا۔ "مبارک باد" "مبارک ہو"۔ "مٹھائی واجب ہو گئی"۔ وغیرہ آوازیں آتیں۔ میں نے گھر سے نکلنا کم کر دیا تھا۔

بڑی بوڑھیوں کے پاس ان دنوں میرا ہی ذکر رہتا۔ حسین چہروں کے بیچ میں کسی کو میرا نام لے کر چھیڑا جانے لگا۔ اور بزرگوں میں میری عزت ہونے لگی۔ ـــــ اب تک جہاں بڑے بوڑھے بات کرتے ہوتے اور میں پہنچ جاتا۔ تو نادان اور بچہ سمجھ کر مجھے رفو چکر کر دیتے تھے۔ مگر اب ایسی جگہوں پر میری قدر ہونے لگی تھی۔ میری رائے دریافت کی جانے لگی اور اکثر مشیر ان پر عمل کیا جانے لگا۔

میں خلاف امید اپنی قدر دیکھ کر بہت خوش تھا۔ مگر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا یہ دھوم دھام ختم ہوتی گئی۔ اور آخر ایک دن وہ آیا۔ جب وہ تذکرے، چہل پہل ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے ـــــ گویا تالاب کے رکے ہوئے پانی میں ایک کنکری پھینکی گئی ـــــ ہلکا سا شور ہوا ـــــ پانی پھٹا۔ لہریں اٹھیں اور پھر پانی کی سطح پہلے کی طرح خاموش ہو گئی ـــــ یا جیسے گاڑی پلیٹ فارم پر آئی ـــــ شور و غل ہوا ـــــ اور پھر گاڑی چھوٹنے کے بعد موت کی سی خاموشی چھا گئی ـــــ

اب "مبارکبادوں" کی تعداد کم ہو گئی تھی۔ البتہ روزانہ ایک نہ ایک شخص مبارکباد پیش کر دیتا تھا۔ جس سے یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ میں نے میٹرک پاس کیا ہے۔

آگے تعلیم جاری رکھنے کی ہمت نہ تھی۔ معلوم نہیں کس طرح میٹرک پاس کیا تھا۔ اس لئے بہتر یہی سمجھا کہ گھر پر آرام کیا جائے —— مگر آرام کہاں نصیب —— ایک روز والد صاحب نے فرما ہی دیا کہ "بھئی دن رات بیکار پڑے رہتے ہو۔ کسی کام میں لگ جاؤ —— ملازمت کر لو یا تجارت شروع کر دو۔" میں نے بھی سوچا کہ بات تو ٹھیک ہے۔ اور پھر طبیعت بھی ایک سی زندگی سے اکتا گئی تھی۔ مگر تجارت کی طرف قطعی رجحان نہ تھا —— اور ملازمت میں کلرکی مجھے پسند نہ تھی۔ مگر میٹرک پاس کو اور جگہ بھی کیا ملتی —— خیر تمام باتیں سوچ کر مصمم ارادہ کر لیا کہ نوکری کر ہی لینی چاہیئے۔ ایک دور کے عزیز شہر میں رہتے تھے۔ دوسرے روز میں بتائے ہوئے راستوں پر چلتا ہوا اُن کے گھر پہنچ گیا۔

وہ میرے چچا ہوتے تھے۔ کہیں دفتر میں نوکر تھے۔ صبح کو جاتے تھے اور چراغ جلے آتے تھے۔ وہ تین دن تک تو میں نے ملازمت کا ذکر ہی نہیں کیا —— ٹھاٹ سے مہمانی کرتا رہا —— مگر پھر ایک روز بات میں بات نکلتی چلی آئی۔ اور میں نے ہمت کر کے کہہ دیا کہ میں ملازمت کی تلاش میں آیا ہوں۔ کہیں کوئی عمدہ جگہ ہو تو دلوا دیجئے۔ پہلے تو وہ کچھ دیر سوچتے رہے۔ میں سمجھا شاید کوئی جگہ نظر میں ہے۔ مگر وہ کہنے لگے "بھیا! ملازمت ملنی تو آج کل محال ہے۔ اسکول اور کالجوں کے لڑکوں نے چھٹیوں میں نوکری کر لی ہیں۔ خیر دیکھو۔ کل کچھ درخواستیں لے کر جانا شاید کوئی جگہ مل جائے۔"

میں خوش ہو گیا۔ خیالی منصوبے باندھنے لگا۔ کہ یوں دفتر میں پہنچا۔ اور آفیسر نے چچا کا نام دیکھتے ہی تپاک سے بٹھایا۔ اور فوراً جگہ مل گئی۔

دوسرے روز انھوں نے مجھے کئی درخواستیں لکھ دیں۔ معلوم نہیں کن دفتروں میں جانے کو کہا تھا۔ نام تو یاد نہیں رہے۔ بہرحال تھے وہ دفتر ہی ——— دفتر کھلنے کا وقت ۱۰ بجے تھا۔ مگر میں وہاں ۹ بجے سے ہی چکر لگانے لگا تھا ——— چپراسی نے پوچھا بھی کہ کہئے کیا کام ہے۔

مگر یہاں تو یہ سمجھے ہوئے تھے۔ کہ ان لوگوں کو منہ لگانے سے اپنی پوزیشن خراب ہوتی ہے۔ اس لئے خاموش رہے۔ جب اس نے دو ایک بار اور اسی طرح پوچھا۔ تو رعب ڈالنے کے لئے کہہ دیا کہ آفیسر صاحب سے ملنا ہے۔ اور پھر وہ عجیب طرح سے مجھے سر سے پیر تک دیکھ کر خاموش ہو گیا ——— میں مسلسل چکر لگاتا رہا ——— درخواستیں پڑھتا رہا ——— مگر دفتر کھلنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ میں نے سوچا قریب ہی لائبریری ہے۔ چلو کچھ دیر تک اخبار ہی دیکھا جائے۔ جب تک دفتر بھی کھل جائے گا۔

لائبریری میں اخبار دیکھتا رہا ——— رسالے پڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ گھڑی نے گیارہ بجائے۔ مجھ کو اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا۔ تیزی میں زینے سے اترا اور دفتر کے زینے پر چڑھ گیا ——— آگے بڑھتا مگر دروازے پر No admission کا بورڈ دیکھ کر رک گیا۔ اندر کلرک کام کر رہے تھے۔ کوئی تیزی سے کوئی سستی سے ——— کوئی کاربن پیپر جیب میں رکھ رہا تھا۔ تو کوئی نب نکال کر ٹوپی کی سیون میں دھر رہا تھا۔ غرضیکہ میں سب کچھ دیکھتا رہا۔ مگر

سوال یہ تھا کہ آفیسر کا کمرہ کون سا ہے۔ کیونکہ اس کمرہ میں تو سب کلرک معلوم ہوتے تھے ــــ میں برآمدے میں ٹہلنے لگا ــــ سگریٹ پیتا رہا اور سوچتا رہا کہ اندر کس طرح داخل ہوا جائے۔

اتنے میں وہی چپراسی نکلا ــــ میں نے اس سے پوچھا کہ آفیسر صاحب کہاں ہیں۔

"ابھی آئے ہی نہیں" اس نے ٹکا سا جواب دے دیا۔

"چلو یہ بھی اچھا ہوا" میری زبان سے طنزاً نکلا۔ میں نے وقت کو کارآمد بنانے کے لئے پنسل اور کاغذ نکال لیا۔ دماغ موزوں ہونے لگا۔ اور دس منٹ کے بعد اس کاغذ پر "ایک بلینک ورس" (نظم معرا) بعنوان "ماں کار" تیار تھی ــــ میں اپنی کامیابی پر جھوم اٹھا۔

نظم مکمل ہو جانے کے بعد پھر میں سوچنے لگا۔ کہ کس طرح درخواست اندر پہنچائی جائے ــــ سمجھ میں یہ آیا۔ کہ گیٹ کیپر کسی طرف کو ہٹے تو may I come in sir کہہ کر گھس جایا جائے۔ میں موقع کا انتظار کرنے لگا۔

اتنے میں دیکھا۔ کہ ایک کتے کا بچہ ایک بکری کے بچے کو مار رہا ہے۔ گیٹ کیپر کی رگِ ہمدردی پھڑک اٹھی۔ اور وہ کتے کی طرف جھپٹا۔ اور ادھر میں اجازت لے کر اندر گھس گیا۔ معلوم نہیں کہ واقعی کسی نے اجازت دی تھی یا نہیں۔ بہر حال ایک منٹ میں میں کمرے کے اندر موجود تھا۔

اب سوال یہ درپیش تھا کہ درخواست کس کو پیش کی جائے۔ میں مستقل سوچتا چلا جا رہا تھا ــــ ہیڈ کلرک جانے کون ہے؟ سپرنٹنڈنٹ کہاں ہیں۔ اور آفیسر

جانے کس جگہ تشریف فرما ہیں ــــــ میں نے دیکھا کہ ایک کلرک بہت ہی سادہ لباس میں بیٹھا ہوا خاموشی سے کچھ کام کر رہا تھا ــــــ میں نے اندازہ کیا کہ وہی سب سے سیدھا کلرک تھا۔ لہٰذا اُس سے پوچھنے کے لئے بڑھا۔ مگر میں نے سوچا کہ اگر نرمی اور التجا سے پوچھا۔ تو ممکن ہے کہ گیٹ کیپر کی طرح یہ بھی غرور کے نشے میں مست ہو جائیں۔ اور بات کرنا مناسب نہ سمجھیں۔ اس لئے ذرا سختی سے کہا۔

"آفیسر صاحب کہاں ہیں؟" جیسے کہ وہ بھی کوئی گیٹ کیپر ہو۔

میرے تحکمانہ طرز گفتگو سے وہ جل گیا۔ بھویں کھنچ گئیں۔ عینک کے گوشوں سے وہ مجھے دیکھنے لگا۔

"کیا ہے؟" انھوں نے بہت غصے میں پوچھا

"ملازمت کے لئے ایک درخواست لایا ہوں" میں نے کہا

انھوں نے مجھ سے درخواست مانگی میں خوش ہو گیا۔ مگر انھوں نے درخواست لے کر سرخ پنسل سے vacancy No لکھ دیا۔ مجھے ان کی خفگی کا پوری طرح اندازہ نہ ہوتا۔ اگر دوسرے روز وہ میرے ایک دوست کو نوکر نہ رکھ لیتے۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہی آفیسر تھے۔

چار و ناچار شکستہ دل زینے سے اتر کر سڑک پر چلنے لگا معلوم نہیں کدھر بس چلا جا رہا تھا ــــــ ناک کی سیدھ میں۔

دوسری درخواست شہر سے چار میل دور کے ایک دفتر میں پہنچانی تھی۔ مجھے یہ بھی نہ معلوم تھا کہ دفتر کہاں ہے پھر بھی چلتا رہا۔ پھر سوچا کہ یوں ہی چلتے رہنا تو عقل کے خلاف ہے۔ لہٰذا لوگوں سے پوچھنا شروع کیا۔ کہ بھائی فلاں آفس کس جگہ ہے

کوئی کہتا سیدھے چلے جاؤ ـــــ بہت دور پر ایک سینما ہاؤس ملے گا۔ ادھر سے بائیں طرف کو مڑ جائیے۔ آگے چل کر ایک ڈھال ملے گا۔ ادھر سے ایک گلی ملے گی۔ جہاں گلی ختم ہوتی ہیں پر آفس ہے"۔ وہ ایک سانس میں سب کچھ کہہ گئے۔ اور میں یہی سوچتا رہا۔ کہ دماغ میں کچھ رہ بھی گیا ہے۔ پھر بھی ازراہِ تکلف ان کا شکریہ ادا کر کے آگے بڑھ گیا۔

کچھ دور چل کر ایک اور شریف صورت بزرگ سے پوچھا۔ کہنے لگے "داتا گنج پل کے پاس ہے"۔ میں نے داتا گنج کا پل اس شہر میں آج ہی سنا تھا۔ مگر مزید تفصیل نہ پوچھ سکا کیونکہ وہ چند قدم آگے نکل گئے تھے۔

ایک صاحب کہنے لگے کہ قیصر باغ سے پچھم کو چلے جائیے۔ کچھ دور تک املتاس کے دورویہ درخت ملیں گے اس طرف سے دائیں کو گھوم جائیے۔ گول پارک ملے گا۔ پھر ایک سرکاری کنواں ملے گا۔ کنوئیں کے پاس سے سیدھی گلی میں چلے جائیے۔ پھر بائیں طرف مڑ جائیے۔ آپ چوراہے پر پہنچ جائیں گے۔ چوراہے پر سپاہی سے پوچھ لیجئے گا۔

"عجیب احمق ہو"، میں نے اپنے دل ہی دل میں کہا: "یہ دفتر کا پتہ ہے کہ علاؤالدین کے چراغ کا سراغ بتایا ہے اور طرہ یہ کہ نامکمل پتہ۔ یعنی چوراہے پر پہنچ کر سپاہی سے پوچھ لیجئے گا"

مجھے چند لمحے تک خاموش دیکھ کر وہ سمجھے کہ شاید سمجھ میں نہیں آیا ہے۔ کہنے لگے "چلے جائیے نہایت آسان پتہ ہے۔ مجھے اجازت دیجئے"۔

"شکریہ۔ سلام علیکم"، میں نے کہا۔ اور حسرت بھری نظروں سے اِدھر اُدھر

دیکھنے لگا۔ کسی نے شمال کی طرف دفتر کا پتہ بتایا۔ اور کسی نے جنوب کی جانب۔ کسی نے مشرق کی طرف اشارہ کیا تو کسی نے مغرب کی طرف جانے والی سڑک پر لگا دیا —— میں اس الجھن سے گھبرا گیا تھا —— دو بج رہے تھے۔ اور سورج بڑی تیزی سے چمک رہا تھا —— لوگ اپنی دوکانوں میں بجلی کے پنکھے لگائے بیٹھے ہوئے تھے —— چھوٹی چھوٹی دوکانوں کے آگے سائے کی خاطر سائبان پڑے ہوئے تھے اور میں اس گرمی میں سودائیوں کی طرح، آوارہ لوگوں کی مانند پھر رہا تھا —— دماغ گرمی کی شدت سے کھول رہا تھا۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جم گئی تھیں —— پائنچوں پر ایک ایک بالشت اونچا تک گرد جم گئی تھی۔ میں ایک گھنے پیڑ کی چھاؤں میں دم لینے لگا —— ظہر کا وقت ہو رہا تھا —— کانوں میں اذان کی آواز آئی، اللہ یاد آگیا —— میں جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا مسجد میں پہنچ گیا۔ وضو کیا تو طبیعت کو کچھ فرحت ہوئی —— نماز پڑھ کر کچھ لوگوں سے آہستہ سے دفتر کا پتہ پوچھا —— جیسے کوئی مجرم پوچھتا ہے۔ مگر کسی نے کچھ نہ بتایا —— ایک مولانا نے ایک دوسرے صاحب کی طرف اشارہ کیا کہ ان سے پوچھئے —— وہ ابھی نماز پڑھ رہے تھے۔ مرتا کیا نہ کرتا —— وہیں بیٹھ گیا خدا خدا کر کے وہ نماز پڑھ چکے —— میں نے عرض حال کی —— کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر اُن کے چہرے پر ایک عجیب رنگ دوڑ گیا۔

کہنے لگے "میرے ساتھ چلنا میں تم کو خود آفیسر صاحب سے ملا دوں گا" میں خوش ہو گیا —— وہ چلنے لگے اور میں بھی اُن کے ساتھ ہولیا ——

چلتے چلتے میں نے پوچھا "آپ کا اسم مبارک؟"

"خاکسار کو شوکت علی کہتے ہیں"

"بہت خوب" میں نے کہا۔ اور شوکت صاحب کی حالت پر غور کرنے لگا۔

وہ خاموش چل رہے تھے۔ انگریزی بال۔ مانگ نکلی ہوئی ــــ ٹوپی ہاتھ میں لے لی تھی ــــ آنکھوں پر چشمہ رکھا ہوا تھا ــــ مگر چہرے سے عجیب چالاکی اور ہوشیاری نمایاں تھی ــــ بظاہر کچھ اچھے آدمی معلوم نہ ہوتے تھے۔ پھر بھی ملازمت کی لالچ ایسی تھی کہ میں چلا جا رہا تھا۔

تنگ و تاریک گلیوں سے ہوتے ہوئے ہم لوگ ایک کھنڈر نما مکان پر پہنچے۔

"یہ آپ کا گھر ہے" شوکت صاحب بولے "کچھ دیر آرام فرمائیے، پھر چلیں گے"

"بہت اچھا" میں نے کہا اور بیرونی کمرے میں بیٹھ گیا۔ کمرہ کیا تھا ٹوٹے ہوئے کھنڈر کا ایک اچھا خاصہ نمونہ تھا۔ شوکت صاحب تو اندر چلے گئے۔ اور میں باہر بیٹھا رہا ــــ مسہری پڑی تھی میں لیٹ گیا ــــ سگریٹ پیتا رہا۔ اور شوکت صاحب کے انتظار کی گھڑیاں گنتا رہا۔ اسی حالت میں نہ جانے کب نیند آگئی ــــ جب آنکھ کھلی تو بالکل شام ہو چکی تھی۔

"اُفوہ" میری زبان سے بے اختیار نکلا، اور میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں شوکت صاحب ہنستے ہوئے وارد ہوئے۔

"کہئے صاحب آپ تو سو ہی گئے"

"جی" میں نے شرمندگی سے کہا "تو کیا اب ملاقات نہیں ہو سکتی"

"نہیں نہیں! منہ ہاتھ دھوئیے!! ابھی چلتا ہوں"

اور چند منٹ بعد اُنہی تاریک گلیوں سے ہم واپس ہو رہے تھے۔ آفیسر سے ملنے کی خوشی میں میں اپنا ہیٹ بھی شوکت صاحب کے کمرے میں بھول آیا تھا۔ مگر یہ سوچ کر کہ واپسی میں لے لوں گا۔ میں نے اُن سے کچھ ذکر نہ کیا ــــ تاریک گلیوں کی بھول بھلیاں ختم ہو رہی تھیں۔ سڑک نظر آ رہی تھی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ عالی شان عمارتیں جو غریبوں پر ہنس رہی تھیں۔

"انہیں میں سے کوئی کوٹھی آفیسر صاحب کی بھی ہو گی" میں سوچنے لگا اور تیز تیز قدم اٹھا کر سڑک پر آ گیا ــــ سڑک زندگی کے ہنگاموں سے معمور یہ سوچ کر کہ آفیسر صاحب کی کوٹھی قریب ہی ہو گی۔ میں نے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور گلے تک شیروانی کے بٹن لگا لئے ــــ اور پھر لمحوں میں شوکت صاحب ایک حسین کوٹھی کے زینے پر چڑھ رہے تھے ــــ جس بے تکلفی سے شوکت صاحب بات کر رہے تھے۔ اس سے یہی ظاہر ہو رہا تھا۔ کہ آفیسر صاحب ان کے پرانے دوستوں میں سے ہیں۔ اس خیال سے میں خوش ہو گیا ــــ "اب تو نوکری مل گئی"۔ میں سوچنے لگا ــــ اور ان کے ساتھ ہی زینے پر چڑھنے لگا اور ایک منٹ بعد ہی میں ایک بقعۂ نور کمرے میں موجود تھا ــــ آفیسر صاحب کی بجائے ایک حسینہ مسہری پر بیٹھی نظر آئی ــــ میں حیران تھا، کہ یہ ماجرا کیا ہے ــــ ہمیں دیکھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آئیے! تشریف لائیے!!" مجھے پہلی بار شدت سے احساس ہوا، کہ میں کہاں ہوں ــــ ایک لمحے کے لئے میری زبان گنگ ہو گئی ــــ دماغ پریشان

ہو گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ آخر یہ سب کیوں اور کیسے ہو گیا ـــــ میں نے سوچا کہ بھاگ جاؤں ـــــ پیچھے مڑا۔ مگر شوکت صاحب ندارد تھے ـــــ

اتنے میں وہ جان شبستاں قریب آ چکی تھی ـــــ اس نے ہاتھ پکڑ کر مسہری پر بٹھا لیا ـــــ میں بھی مجبور ہو گیا۔

میں نے تصور میں اپنی جیب کا جائزہ لیا۔ جس میں صرف دس روپے اور شاید ساڑھے گیارہ آنے باقی تھے ـــــ مگر کیا کرتا ـــــ فرار کی راہیں مسدود تھیں ـــــ " ـــــ پھر کیا ہوا۔ وہی جو ایسے رنگین شبستانوں میں ہوا کرتا ہے کفر و معصیت کے ایوانوں میں ظہور پذیر ہوتا ہے ـــــ ایمان فروش نظاروں میں آنکھیں کھو گئیں ـــــ گناہ کی مخمور بدلیوں نے ہم دونوں کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

صبح کو میں تھکا ہارا ـــــ گناہ کے نشہ میں چور زینے سے اتر رہا تھا۔ جیب میں قسمت سے صرف ٹکٹ کے پیسے بچ رہے تھے ـــــ ہیٹ شوکت صاحب کے قبضہ میں تھا ـــــ اور ان کی گلی مجھے یاد نہ تھی۔ میں کچھ سوچنے کی کوشش کر رہا تھا ـــــ مگر کیا؟ یہ مجھے نہیں معلوم ـــــ شوکت صاحب ... طوائف کا شبستان ... ملازمت ... اور چچا صاحب ... سب میرے خیال میں سینما کے پردے کی تصویروں کی طرح گھوم رہے تھے .... یہ سب کیونکر ہوا اور کس طرح ہوا میں خود نہیں بتا سکتا ـــــ سوچتا ہوں۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا ـــــ

میں اسٹیشن کی طرف تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا۔ تاکہ سندیلہ کو جانیوالی پہلی گاڑی پکڑ سکوں ـــــ